آواز سرگوشیوں کی

{منتخب افسانے}

بہت ہی پیارے
منظور مظلوم صاحب
کی خدمت میں
پیار و خلوص
کے ساتھ
ویریندر پٹواری
۱۱/۳/۹۷

ویریندر پٹواری

موڈرن پبلشنگ ہاؤس
۹۔ گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

AAWAZ SARGOSHION KI [SHORT STOREIS] BY V. PATWARI

RS. 75.00

افسانے

ویریندر پٹواری

آواز سرگوشیوں کی

اندرونِ صفحات

میں ایک درخت ہوں
صدیوں پرانا
چوس رہا ہوں کب سے
پانی کے قطرے
زمین کی نچلی تہوں سے
گزارتا رہا ہوں تب سے
تذبذب کی زندگی
برگِ آرزو کو تھام کر
اور ڈرتا رہا ہوں اکثر
بادِ صرصر سے
برف کے بھاری بوجھ
دھوپ کی تپش سے
لکڑ ہارے کی کلہاڑی سے
مگر اب
نجانے کیوں !___؟
لرز رہا ہوں
ٹینکوں کی پیش قدمی سے
بارود کے دھماکوں سے
طیاروں کی گڑگڑاہٹ سے

اُف ! مگر پھر بھی
آشا ، میری آشا
اس صدی کی آشا
میرے سائے کو
تحفظ سمجھ کر
گہری نیند سو رہی ہے
جبکہ گوتم
برگد کے پیڑ سے لپٹ کر
نیلے آکاش میں
ایک سفید کبوتر کا
تعاقب کرتے ہوئے
باز کو دیکھ کر
تڑپ رہا ہے
اور میں
لب سی کر ، نظریں جھکائے
رو رہا ہوں
صلیب پر لٹکے ہوئے
مسیحا کی طرح !
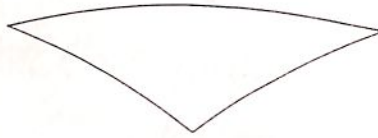
دادی ماں ہر وقت کچھ نہ کچھ بڑبڑاتی رہتی ہے۔ مگر ان کا یہ شکوہ یا شکایت بھی درست ہے کہ گھر کا کوئی فرد نہ تو کھل کر ان سے بات کرتا ہے اور نہ ہی کوئی ان کو یہ بتاتا ہے کہ اس کے اپنے ہی گھر میں کیا ہو رہا ہے۔ کون کہاں گیا ہے، کون کب آیا ہے اور کون کیا کر رہا ہے۔ بقول ان کے وہ بھی گھر کے پُرانے فرنیچر کی طرح ایک بے معنی، بے مطلب چیز بن کر رہ گئی ہے۔ قصور کس کا ہے یہ شاید وہ خود بھی نہیں جانتی ہیں کیونکہ کبھی بہو، کبھی پوتا، کبھی اپنا ہی بیٹا یا پوتی یوں نظر آتے ہیں جیسے دروازے پر کھڑا بندوق لیے دشمن۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ دادی ماں کی اہمیت نہیں ہے بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ سارے گھر کے افراد ایک طرف اور دادی ماں دوسری طرف۔ گویا ٹگ آف وار (TUG OF WAR) میں دادی ماں سب کو گھسیٹ کے اِدھر اُدھر لیے جا رہی ہے۔ یا پھر شکست خوردہ افراد خود ہی رسّی چھوڑ کر چوہوں کی طرح اِدھر اُدھر بھاگتے نظر آ رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب کبھی ۷۵ سالہ بڑھیا کمرے سے باہر آتی ہے تو لگتا ہے کہ ہواؤں کا رخ ہی بدل گیا ہو۔ کسی نے کچھ کہا تو گھر میں زلزلہ آجاتا ہے ہاں! میں ہی تو ایک شخص ہوں کہ جو دادی ماں کو دیکھ کر پریشان تو ہو جاتا ہوں مگر ہراساں نہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں ٹھہرا کرایہ دار جو صرف دادی ماں کی طرف داری کی وجہ ہی سے نکالا نہیں جا رہا ہوں ورنہ آج صبح ہی مالک مکان یعنی دادی ماں کے بیٹے نے گھر خالی کرنے کی تاکید کی ہے۔ لیکن مجھے فکر کس بات کی ہے۔ دادی جو ہے! بچا لے گی مجھے۔

ظاہر ہے کہ دادی ماں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے مجھے ان کی ہر بات سُن لینی پڑتی ہے۔ حالانکہ وہ باتیں سینکڑوں بار پہلے سُن بھی لی ہوں تب بھی کیا کروں، گئی رات جب دادی ماں سے اجازت لے کے جانے لگتا ہوں تو وہ پھر روک کر کہتی ہے۔ لو جو بات مجھے کہنی تھی وہ بتائی ہی نہیں۔ آج جب میں نے صبح سویرے کمرے میں جاکر پوچھا کہ دادی ماں کہہ ہی ڈالیں نا وہ بات! تب عین اسی وقت مالک دودھ کا گلاس لے کر کمرے میں داخل ہوا۔ معمول کے مطابق مالک اشاروں میں بات کر کے مجھ سے پوچھتے رہے کہ کب بیچھا

پھوڑ دو گے ہمارا اور دادی ماں ملتجی نگاہوں سے یہ سمجھاتی رہیں کہ جو کہنا تھا آج بھی نہیں کہہ سکی۔ اور اس کے بعد میں کمرے سے باہر آیا۔ ان کا بیٹا بھی کمرے سے باہر آیا اور پھر جونہی دادی ماں کمرے سے باہر آگئی تو گویا جوالا مکھی نے سارے گھر کو ہلا دیا۔ مالک مالکن، پوتے اور پوتی کے علاوہ گھر میں کام کرنے والے نوکر چاکروں پر لاوا گرتا رہا۔ کچھ دیر بعد جب دادی ماں اپنے کمرے میں چلی گئیں تو میں نے ایک نوکر سے پوچھا کہ آج کیا ہوا جو دادی ماں ایک طوفانی دورے پر نکل پڑی تھی۔ بہرحال جواب تو کوئی نیا تھا نہیں۔ وہی پرانی گھسی پٹی باتیں۔ اور دادی ماں کی بات بات پر نکتہ چینی۔ الزامات، شکوے شکایتیں وغیرہ۔ آفت گویا ٹل گئی اور سب لوگ مالک کے ارد گرد جمع ہو کر گویا واپسی ہوائی حملے کے بارے میں سوچنے لگے۔ مگر بے چارہ مالک معمول کی طرح سب کو سمجھاتا رہا۔ رہنے بھی دو۔ چراغِ سحری ہے۔ لو بھڑک رہی ہے مگر ساتھ ساتھ ٹمٹما بھی تو رہی ہے۔

اپنی ماں کے بارے میں کوئی ایسا کہے تو نفرت ہونی ہی چاہیئے ایسے بیٹے پر مگر مجھے اس پچاس سالہ شخص پر رحم آجاتا ہے جس کو بھگوان نے عزت، شہرت، دولت دی ہے۔ حالانکہ شروع شروع میں سوچ کچھ اور تھی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب یہاں ٹرانسفر ہوئی تھی۔ مجھے کرائے پر مکان نہیں مل رہا تھا۔ ویسے ہی اتفاقاً دادی ماں سے ملاقات ہوئی۔ یوں تو میں اپنے ہی خیالوں میں کھویا تھا مگر پھر بھی دادی ماں کی باتیں سننے کی کوشش کر رہا تھا۔ پہلی ہی ملاقات میں اس نے مجھے اپنی زندگی کے بارے میں سب کچھ بتا دیا یعنی اس کا باپ کسی کلب میں کام کرتا تھا۔ اس زمانے میں بھی وہ اپنے بچوں کے لیے کریم صابن پاؤڈر لیا کرتا تھا۔ انگریزوں کی دی ہوئی چیزیں مثلاً شیشے کے گلاس وغیرہ لایا کرتا تھا۔ شادی ۱۴ سال کی عمر میں ہوئی تو شادی میں ۲۰ تانگے تھے پانچ سو باراتی پیدل چل کر آئے تھے وغیرہ وغیرہ۔ اور وہ یوں مزے مزے سے یہ سناتی رہی تھی جیسے کوئی طالب علم بتا رہا ہو کہ پورس کی فوج میں اتنے ہاتھی آئے تھے۔ اتنے گھوڑے، اتنے پیادے اور پھر بات سے بات نکال کر یا جوڑ کر یہ بتایا تھا کہ اس کا بیٹا کنجوس مکھی چوس ہے اور اپنے بیٹے کی بارات میں صرف ۵۰ باراتی لے رہا ہے۔ کٹوا رہا ہے نا ہماری ناک۔ باپ زندہ ہوتا تو اسی روز شرم سے دم توڑ دیتا۔ ارے وہ تو خوش نصیب تھا۔ عدالت کے باہر لوگوں کی عرضیاں لکھتا رہتا تھا۔ لوگ ملنے آتے تھے تو میں بس دو دو کلو دودھ کی نمکین چائے بنایا کرتی تھی۔ اب میرے بیٹے کو دیکھو۔ جج ہے مگر کر کیا رہا ہے کچھ بھی تو نہیں۔ میرے پتی نے پہلی بار جب اپنی کمائی کے پیسے اپنی ماں کو دیے تھے تب اس خوش نصیب عورت نے اپنے تمام رشتہ داروں کو ایک ایک چاندی کا روپیہ بھیجا تھا اور ڈھیر سارے شکر پارے الگ جو میری

ماں نے بھیجے تھے۔ اب میرے پوتے کو تو دیکھو۔ دادا پر جاتا تو کتنی اچھی بات تھی۔ گیا ہے اپنے باپ پر پتہ نہیں تین ہزار یا تین سو روپے تنخواہ لیتا ہے اور پوچھو اس سے کیا کبھی مجھے تین روپے بھی دیے اس نے؟ بس دکھاوا ہے۔ دادی ماں آم لایا ہوں۔ دادی ماں انگور لایا ہوں۔ دادی ماں شال لایا ہوں۔ دراصل قصور میری بہو کا ہے۔ نکمّی ہے دن بھر جانے کیا کرتی رہتی ہے۔ کام کاج تو نوکر چاکر کر لیتے ہیں۔ ارے جب میں جوان تھی تب روز بیس آدمیوں کا کھانا بنایا کرتی تھی۔ ڈھیر سارے برتن صاف کیا کرتی پھر چرخہ چلایا کرتی تھی۔ اپنے ہاتھوں سے اُون تیار کر لیا کرتی تھی۔ خود تو بگڑ ہی گئی ہے موٹی۔ اب اپنی بیٹی کو بھی بگاڑ دیا ہے جبھی تو مریل سی لڑکی ہے۔ ہڈیاں نظر آ رہی ہیں۔ کام کاج کر لیتی تو صحت بھی اچھّی رہتی۔ اس کو تو چائے بھی نہیں بنانی آتی۔ دن میں دس بار چائے پی لیتی ہے۔ پرایا دھن ہے سسرال جائے گی تو کیا کرے وہاں۔ ستار بجائے گی یا پھر وہ۔ آ۔ آ۔ آ گانا گائے گی۔ لو دیکھو مردوں کی طرح سائیکل چلاتی ہے، کیا ہو گیا ہے ان لوگوں کو۔ بہو اور پوتی نے مَردوں کی طرح بال رکھے ہیں اور میرے پوتے کو تو دیکھو لڑکیوں کی طرح بال اگائے ہیں۔ ریچھ لگ رہا ہے۔ اس روز میں نے دادی ماں کی تمام باتیں خاموشی سے سن لی تھیں۔ بس یہی پسند آیا تھا ان کو اور خود ہی اپنے بیٹے سے پوچھے بغیر ساتھ والا کمرہ دے دیا تھا۔ تب سے اب تک بس یہی باتیں روز سنتا رہتا ہوں۔ اور گھر کے لوگوں کی بے بسی کا منظر دیکھتا رہتا ہوں اور کبھی کبھی دادی ماں کی حرکتوں پر غصہ بھی آجاتا ہے۔ مگر مصلحتاً خاموش رہتا ہوں۔ مکان خالی کرنا پڑا تو؟ ورنہ ایک ذی ہوش ——— انسان کی طرح مجھے دادی ماں کی ہاں میں ہاں ملانے کی بجائے ان سے یہ کہہ دینا چاہئیے کہ یہ آپ کیا کر رہی ہیں۔

کچھ دن پہلے جج صاحب کا چپراسی کچھ کاغذات لینے گھر آیا تو ملاقات دادی ماں سے ہوئی۔ اپنی شادی سے لے کر پتی کی موت تک کی تمام کہانیاں قصّے سنانے کے علاوہ اس بے چارے کو زبردستی کھانا کھلایا۔ اور نمکین چائے پی کر ہی دفتر جانے کی ہدایت کی۔ مالکن بیچاری بے بس تماشائی کی طرح کھڑی رہی۔ کرتی بھی کیا۔

کل ہی کی بات ہے جج صاحب باغ میں بیٹھے کام کر رہے تھے تو دادی ماں تیل کی شیشی لے کر ان کے گنجے سر پر تیل لگانے لگی۔ وہ بھی اتنا کہ تیل ماتھے سے بہتا ہوا آنکھوں پر ٹپکتا رہا۔ جج صاحب کچھ کہتے بھی مگر میری موجودگی میں دادی ماں شیرنی بن جاتی ہے۔ اور غیر کے سامنے کوئی دادی ماں کو ٹوکے یا

رو کے بھی تو کیسے۔ لوگ بیٹے ہی کو قصوروار سمجھیں گے نا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ دادی مجھے اپنا سپہ سالار سمجھتی ہے اور جب بھی کسی مہم پر نکلتی ہے۔ تو مجھے ساتھ ساتھ رکھ کر۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ جج صاحب اور ان کے گھر والے مجھ سے خائف رہتے ہیں۔ اور میری موجودگی کو پسند نہیں کرتے ہیں۔ یہ سب دیکھ دیکھ کر میں بھی تنگ آچکا ہوں۔ اپنی مجبوری دیکھوں یا گھر والوں کی بےبسی۔ جبر میں نے گھر چھوڑنے کا فیصلہ کر ہی لیا تھا۔ اور یہی بات جج صاحب کو بتلانے گیا تھا۔ مگر وہ سب لوگ مایوس تھے سب کے چہرے اترے ہوتے تھے اور کہیں جانے کی تیاریاں کرنے میں مصروف تھے جب کہ دادی ماں ایک جاسوس کی طرح یہ جاننے کی کوشش کر رہی تھیں کہ گھر میں کیا ہو رہا ہے۔ کبھی بیٹے سے پوچھ لیتیں کبھی بہو سے، کبھی پوتے سے اور کبھی پوتی سے کسی نے کچھ بتایا نہیں تو مہم شروع ہو گئی۔ آندھی طوفان کی مانند دادی ماں کے کمرے کا دروازہ کھلا۔ اور ایک کمزور سی عورت تیزی سے ڈرائینگ روم میں اناپ شناپ بک کر واپس اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس بار حملہ پوتی پر کچھ زیادہ ہی ہو رہا تھا۔ وہ بھی اس حد تک کہ باتوں سے نفرت کی بو آنے لگی تھی۔ میں کمرے میں داخل ہوا تو چیخ چیخ کر کہنے لگی۔ دیکھو ان لوگوں کو کہاں جا رہے ہیں سب۔ مجھے اکیلا چھوڑ کر۔ گلا کیوں نہیں گھونٹ دیتے میرا۔ بیٹا ہی احمق ہے میرا تو کیا کروں۔ سمجھتا نہیں کہ بیوی کو سیر سپاٹے اچھے لگتے ہیں۔ گھر میں رہنا اچھا نہیں لگتا ہوٹلوں کا کھانا اچھا لگتا ہے۔ ان کو چھوڑ دے۔ دیکھو تو اس لڑکی کو۔ اپنی دادی کی پرواہ تک نہیں اسے۔

اور پھر یہ دیکھ کر کسی نے اپنا فیصلہ بدلا نہیں تو دادی ماں اس وقت کمرے سے باہر آئیں جس وقت جج صاحب، اس کی بیوی اور بیٹی کار میں بیٹھ رہے تھے اور دادی ماں کا پوتا کار اسٹارٹ کرنے لگا تھا۔ جج صاحب نے بتایا کہ وہ دہلی جا رہے ہیں۔ تب دادی ماں کار کے سامنے کھڑی ہو کر کہنے لگی جہاں بھی جا رہے ہو چلے جاؤ مگر واپسی پر میرے لیے سنگِ مرمر کی دو مورتیاں لانا۔ ایک شیوجی کی اور دوسری کرشن بھگوان کی۔ ڈیڑھ بوڑھی کہا دیکھی۔

ایسی اوٹ پٹانگ باتوں یا فرمائشوں پر دادی ماں کا پوتا کھل کھلا کر ہنس پڑتا مگر آج اس نے بھی کچھ نہیں کہا اور کار حرکت میں آگئی۔

کار چل پڑی تو گھر کی نوکرانی نے اپنی بھیگی آنکھیں صاف کر کے مجھے بتایا بابوجی بھگوان سے پرارتھنا کرو کہ بٹیا کا آپریشن کامیاب رہے۔ سنا ہے کہ خطرناک بیماری ہے۔ آپریشن کا لفظ سنتے ہی دادی ماں

پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہوگئی۔ میں گھبرا گیا۔ جانے کیا ہونے والا ہے۔ مگر جب بوڑھیا کار کے پیچھے دوڑنے کی کوشش کرتی ہوئی دھڑام سے سڑک پر گر گئی تب میں نے پوچھا کیا ہوا دادی ماں؟ وہ آہستہ سے پوچھنے لگی۔ کیا ہوا ہے میری بچی کو۔ میں اس کی بلائیں لوں گی۔ کیا ہوا ہے میری پوتی کو، میری راجکماری کو۔ وہ رو پڑی اور پھر اس کی زبان پر مہر خاموشی لگ گئی۔ گذشتہ رات جب میں دادی ماں کے کمرہ میں گیا تو اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں آنسوؤں میں دب کر یوں نظر آرہی تھیں جیسے ایک گہرے تالاب میں کسی ڈوبے ہوئے شناسا چہرے کو دیکھ رہی ہوں۔ اس کے ہونٹ ہل تو رہے تھے مگر آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ کچھ گھبرا کر جب میں نے اس کے پوتے کو آواز دی تو وہ اپنی دادی کو دیکھ کر چیخ پڑا۔ "کیا ہو گیا میری دادی کو۔ دادی کچھ بول کیوں نہیں رہی ہیں۔ انکل! دادی ماں کے ہاتھ پاؤں اتنے ٹھنڈے کیوں ہیں" اور پھر وہ ڈاکٹر کو بلانے کی خاطر تیر کی طرح دروازے سے نکل پڑا۔ وہ رو رہا تھا۔

یوں آدھی رات گزر گئی ہے اور جب بھی میں دادی ماں کے پوتے کو تسلیاں دے کر دادی ماں کے چہرے سے چادر ہٹا دیتا ہوں تو اس کے پتھر کے ہونٹ دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے یوں کہہ رہے ہوں کہ بہت کچھ کہا لیکن وہ کبھی نہ کہہ پائی جو در اصل کہنا چاہتی تھی۔ کسی سے بھی نہیں تم سے بھی نہیں۔
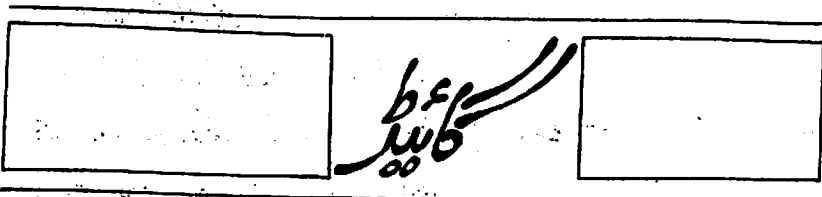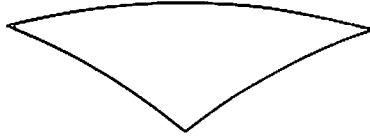
اس باتونی گائیڈ کو میں پچھلے کئی دنوں سے کیسے برداشت کر رہا ہوں یہ مجھے معلوم نہیں۔ مگر کیوں برداشت کر رہا ہوں وہ ایک مجبوری ہے۔ کبھی کبھی یہ سوچتا ہوں کہ یہ آدمی میرے مرحوم داداجی کا پُنر جنم تو نہیں ہے۔ بس باتیں کرتا رہتا ہے۔ صدیوں پرانی گھسی پٹی باتیں۔ کتابی باتیں۔ پیار و محبت کی باتیں۔ مہاتما گاندھی کی باتیں۔ گوتم بُدھ کی باتیں۔ تحریکِ آزادی کی۔ شانتی کی باتیں۔ اشانتی کی باتیں۔ کشیپ رشی کی باتیں۔ کشمیر کی باتیں۔ ستی سر[۱] کی باتیں اور اس وشال جھیل میں رہنے والے اس بھیانک راکھشش کی باتیں جو آدم خور تھا۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ باتیں۔ باتیں اور صرف باتیں جبھی تو مجھے بار بار غصہ بھی آتا ہے مگر کیا کروں مجبوری ہے۔ ویسے یہ آدمی کوئی پیشہ ور گائیڈ نہیں ہے۔ بس سب سے قریب کے گاؤں کا ایک چرواہا ہے۔ بھیڑ بکریاں پالتا ہے اور کبھی کبھار پہاڑوں پر جانے والے مسافروں کا بوجھ اٹھاتا ہے۔ لیکن وہ اپنے آپ کو کچھ اور ہی سمجھتا ہے۔ اس لیے تو اس کی ہر بات میں مشورے کی چاشنی ہوتی ہے۔ احمق ہے یہ نہیں سمجھتا کہ ہر بھیڑ بکریاں پالنے والا موسیٰ نہیں ہوتا اور ہر گائے بیل چرانے والا بھگوان کرشن نہیں ہوتا۔ لیکن ایک بات ہے۔ جب بھی وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ لیتا ہے۔ تب نہ جانے کیوں میری نظریں جھک جاتی ہیں۔ اور پھر ایک بے شکل کا خوف میرا تعاقب کرنے لگتا ہے۔ اگر میں نے کئی بار اس کو چھُو کر نہ دیکھ لیا ہوتا تو شاید میں سمجھ لیتا کہ یہ گائیڈ نہیں بلکہ ان برفیلی پہاڑیوں میں کسی سادھو سنیاسی کی بھٹکتی ہوئی آتما ہے کہیں اس کو میرے بارے میں سب کچھ تو نہیں معلوم ہے؟ نہیں! نہیں! سیدھا سادہ آدمی ہے۔ اور پھر وہ یہ جانتا ہے کہ اگر میں یہ انوکھی گپھا دیکھنے آیا ہوں تو صرف اس کے کہنے پر۔ ورنہ میں کیوں آتا۔ ہا... ہا... ہا... بے وقوف کیا معلوم کہ میں اپنے دوسرے ساتھیوں کو چکما دے کر یہاں آیا ہوں تو ایک مشن لے کر ایک مقصد کی خاطر۔ وہ سمجھتا ہے کہ

[۱] وہ جھیل جو کشیپ رشی نے کشمیر وادی میں تبدیل کی تھی۔

میں بھی اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح پربت کی سب سے اونچی چوٹی پر پرچم لہرانے آیا تھا۔ اسی لیے تو بیچارہ میری دلچسپی کی خاطر اس گپھا کے بارے میں بہت کچھ بتا چکا ہے۔ میرے لیے ایک بہت ہی اچھی بات یہ ہے کہ وہ نہ کوئی سوال پوچھتا ہے اور نہ بات سے بات کرید تا ہے۔ ہاں جب میں اس کی باتوں میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتا تب وہ بھی کبیر کے دوہے گاتا۔ کبھی صوفی سنتوں کا عارفانہ کلام گنگناتا ہے کبھی کبھی یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ بھجن گا رہا ہے یا گوربانی پڑھ رہا ہے۔ خیر وہ جو چاہے کرتا رہے، مجھے خوشی تو اس بات کی ہے کہ اس نے مجھے بہت ہی دشوار سفر کے باوجود بالکل صحیح جگہ پر پہنچا دیا ہے۔ بس آج کی رات گذارنی ہوگی اور کل صبح میں اپنی منزلِ مقصود کی طرف کوچ کروں گا۔ لیکن یہ رات اس کو میرے ساتھ گذارنی ہوگی۔ ورنہ!۔ ورنہ کیا؟۔ نہیں نہیں! میں ڈرتا نہیں ہوں! میرے ارادے مضبوط ہیں۔ میرا عزم بلند ہے! میں جو کچھ بھی کر رہا ہوں سوچ سمجھ کر کر رہا ہوں۔ ایک طے شدہ منصوبے کے تحت کر رہا ہوں۔ مجھ میں جوش ہے۔ ولولہ ہے۔ پھر ڈر کس بات کا۔ ہا۔۔۔ ہا۔۔۔ ہا۔۔۔ ایک سیدھے سادے گائیڈ کی بے تکی باتوں کا؟ ہا۔۔۔ ہا۔۔۔ ہا۔۔۔ جب میرے یہ قہقہے فضا میں گونج اٹھتے ہیں تو بڑا مزہ آتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے اپنی کامیابی کے قدموں کی آہٹ سن رہا ہوں۔ مگر پھر بھی پریشان سا کیوں ہوں؟ شاید اس لیے کہ یہ گائیڈ بہت دیر پہلے لکڑیاں کاٹنے گیا تھا۔ واپس لوٹا کیوں نہیں؟ لیکن اس میں پریشان ہونے والی کون سی بات ہے! آتا ہی ہوگا۔ پھر جب وہ آئے گا ہم سخت سردی کا مقابلہ کرنے کے لیے آگ جلائیں گے۔ آگ دیکھ کر تو جنگلی جانور بھی قریب نہیں آئیں گے۔ مگر؟۔ رات کی تاریکی میں آگ نظر آئے گی۔ اگر دشمن نے دیکھ لی تو۔!۔؟ تو۔ پھر کیا! میرے پاس بندوق ہے۔ ہینڈ گرینیڈ ہیں۔ میں ایک تربیت یافتہ انسان ہوں۔ مقابلہ کر سکتا ہوں۔ مگر یہ سردی۔ اُف! یہ کم بخت گائیڈ کہیں مجھے اکیلا چھوڑ کر بھاگ تو نہیں گیا؟ نہیں نہیں۔ وہ داداجی کی طرح باتیں کرتا ہے۔ داداجی بھی کوئی غلط کام نہیں کرتے تھے۔ وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتے تھے۔ گائیڈ جاتے جاتے یہ کہہ گیا ہے کہ وہ بہت جلد لوٹ آئے گا۔ ہاں۔ وہ ضرور آئے گا۔ لیکن آج جب میں اپنے تمام جذباتی رشتے ناطے توڑ کر ایک بہت ہی اہم مشن پر آیا ہوں تب داداجی کی یاد کیوں آ رہی ہے؟ ارے ہاں۔ اس گائیڈ کو دیکھ کر۔!۔ ہے نا؟

گائیڈ کا نام کیا ہے؟۔ اُف۔ اس نے بتایا نہیں۔ میں نے پوچھا نہیں۔ پھر کیسے جان پاتا۔ کیا معلوم کون ہے۔ ہندو ہے یا مسلمان! ویسے ان پہاڑی علاقوں کے سیدھے سادے لوگ ایک جیسے

نظر آتے ہیں پچھلی بار جب میں ادھناتھ کی یاترا کرنے گیا تھا۔ تب جس آدمی نے مجھے بھگوان شنکر کی کتھا سنائی تھی وہ ہندو نہیں مسلمان تھا۔ یقین نہیں آتا؟ نہیں نہیں یہ کوئی سرکاری پروپیگنڈا نہیں ہے۔ ایمان کی قسم۔! بات گائیڈ کی ہو رہی تھی اور میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ مگر اس وقت یہاں شہر سے بہت دور، بلکہ آس پاس کی بستی سے بھی کوسوں دور پربت کی اس چوٹی پر اکیلا بیٹھا اور کیا کر سکتا ہوں؟ میں جس انوکھی گپھا کے سامنے بیٹھا ہوں دور سے یوں نظر آ رہی ہے جیسے بھگوان شنکر کے چوڑے ماتھے پر ان کی تیسری آنکھ۔ یہ بات بھی مجھے گائیڈ نے اس وقت بتائی تھی جب ہم سب سے کٹھن راستے پر گرتے پڑتے اور پھر سنبھلتے یہاں پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اگر گائیڈ کی باتیں سچی اور صحیح ہیں تب یہ گپھا واقعی دلچسپی کا موضوع ہے۔ بقول اس کے کسی زمانے میں آس پاس ایک بہت بڑی جھیل تھی۔ نام ستی سر۔ جھیل کے کنارے دور دور سے آئے ہوئے رشی منی تپسیا کیا کرتے تھے۔ ان میں ایک کشیپ رشی بھی تھا جو انوکھی گپھا میں رہتا تھا۔ مگر جھیل میں ایک خطرناک آدم خور راکھشس رہتا تھا۔ کشیپ رشی نے راکھشس کو پاتال میں دبا دیا اور جھیل کے پانی کو سمندر میں ڈال کر اس حسین وادی کو جنم دیا۔ اس میں کتنا سچ ہے اور کتنا جھوٹ بھگوان جانے۔ داداجی کہتے تھے کہ اس وادی میں پہلے ناگ رہتے تھے —
لو سنو! کیسی کیسی باتیں کہی جا رہی ہیں۔ شاید اس لیے کہ آج کا نوجوان ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر صرف تواریخ کے اوراق پڑھتا رہے اپنے بارے میں بالکل نہ سوچے۔ اپنے مستقبل کے بارے میں بالکل نہ سوچے۔ مزے کی بات تو یہ ہے کہ گائیڈ کہہ رہا ہے کہ اس گپھا کے سامنے جو گہری جھیل ہے اس میں بھی ایک راکھشس رہتا ہے۔ میں نے پوچھا کہ وہ باہر کیوں نہیں آ رہا ہے تو کہنے لگا کہ وہ گپھا کا منہ دیکھ کر ڈر جاتا ہے۔ ہا... ہا... ہا... ارے وہ تو ایسی اوٹ پٹانگ باتیں کرتا رہتا ہے۔ ابھی جب آئے گا تو کیا معلوم کیا اناپ شناپ بکتا رہے گا۔ کچھ بھی ہو۔ یہ جھیل بہت خوبصورت ہے۔ دور، دور تک پھیلی ہوئی ایک پرسکون جھیل پانی کی سطح پر چھوٹے چھوٹے دائرے جب اپنے ارد گرد پھیلے ہوئے بڑے بڑے دائروں کا تعاقب کرتے ہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے اسکول کے بچے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر ہنستے گاتے ایک ندی پار کر رہے ہیں۔ ارے ہاں! یاد آیا۔ ایک بار ہم تینوں بھائی ندی میں نہا رہے تھے۔ پانی کا بہاؤ تیز تھا۔ بہہ گئے ہوتے ہم تینوں۔ اگر ایک دوسرے کا ہاتھ نہ پکڑ لیا ہوتا۔ اس روز داداجی کو قومی یکجہتی کا انعام بھی ملا تھا۔ داداجی نے تحریک آزادی میں بھی حصہ لیا تھا۔ لو میں جھیل کو دیکھتا رہا اور شام ہو گئی۔ مگر گائیڈ ابھی تک

نہیں آیا۔ اس وقت جھیل کی سطح پر ہلچل ہو رہی ہے۔ کہیں وہ راکھشس باہر نکلنے کی کوشش تو نہیں کر رہا ہے؟ ہاں کچھ ایسا ہی لگ رہا ہے! یقیناً کوئی ہے! مگر کون؟ دھندلی دھندلی روشنی میں کچھ بھی تو دکھائی نہیں دے رہا ہے نا! مگر میں گھبرا کیوں گیا ہوں۔ گائیڈ؟ گائیڈ؟ گائیڈ تم کہاں ہو؟۔! جلدی آجاؤ۔! اُف لگتا ہے وہ نہیں آئے گا۔ بھاگ گیا چکما دے کر۔ اب کیا کروں؟ سردی سے جان نکل رہی ہے۔ میرے خیال میں گپھا کے اندر چلا جاؤں تو بہتر۔ مگر نہیں۔ کیا معلوم وہاں سچ مچ کوئی رشی ہو۔ یا اس کی آتما ہو۔ اگر ہو بھی تو کیا ہوا۔ میرے دل میں کوئی میل نہیں۔ رشی سے آمنا سامنا ہوا بھی تو کیا ہوا۔ میں کوئی راکھشس تو نہیں ہوں جو مجھے پاتال میں پہنچا دے گا۔ مگر۔ آج مجھے کیا ہو گیا ہے؟ میں کیوں ڈر رہا ہوں؟ اور کس سے ڈر رہا ہوں؟ ہاں شاید اس لیے کہ اگر گپھا میں کوئی شیر یا ریچھ ہو تو۔؟ نہیں نہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ جنگل کے خونخوار جانور برف باری کے ساتھ پہاڑوں سے اتر کر نشیبی علاقوں میں چلے جاتے ہیں۔ مگر آج کل کس بات کا ڈر ہے۔ گھر گھر میں بندوقیں ہیں۔ میرے پاس بھی بندوق ہے۔ پھر خونخوار وحشی درندوں سے ڈرنا کیوں؟ مگر یہ خونخوار درندے ہیں کون؟ ہاں یاد آیا۔ داداجی کہا کرتے تھے کہ وہ جو اپنی ہی نسل کا خون کرتے ہیں وہ خونخوار ہوتے ہیں لو میں داداجی کی بات کر رہا ہوں۔ گائیڈ بھی تو یہی کہتا تھا۔ کسی نے اس کو بتا دیا ہے کہ شہروں میں بھائی بھائی کو قتل کرتا ہے۔ اس کی یہ باتیں سن سن کر میرے کان پک گئے ہیں۔ لیکن اب جب کہ مجھے اس کی سخت ضرورت محسوس ہو رہی ہے جانے کہاں غائب ہو گیا۔ کہیں وہ سچ مچ کوئی بھوت پریت تو نہیں تھا؟ جب میں یہاں آرہا تھا تب اچانک ہی مل گیا تھا۔ اور اب اچانک ہی غائب ہو گیا۔

ارے یہ کون آرہا ہے؟ شاید وہی ہے! ہاں ہاں۔ کندھے پر لکڑیاں اٹھائے گائیڈ ہی آرہا ہے۔ لیکن اس کے پاس یہ شیر کی کھال کا بنا ہوا لباس کہاں سے آگیا؟ ایک اجنبی کی طرح وہ سامنے سے گزر کر آگے کیوں چلا گیا۔! یہ کیا۔ یہ کیسا آدمی ہے؟ لکڑیاں لینے گیا تھا اور کندھے پر ایک مرا ہوا ہرن لے آیا ہے۔ مجھے یہ گائیڈ کوئی مشکوک نظر آرہا ہے اچھا ہوا جو میں نے اس کو اپنے دل کی بات نہ بتا دی۔ مگر یہ کیا؟۔ ارے باپ رے۔ یہ تو کوئی اور ہے۔!! یہ ہرن وہ ہرن تو نہیں جس نے سیتاجی کا من موہ لیا تھا۔ میرا مطلب ہے راون کا جادوئی ہرن۔! ۔ یہ شخص راون تو نہیں ہے۔

کہیں پھر سے جنگ شروع ہوگئی تو میرا کام ادھورا رہ جائے گا۔ نہیں نہیں۔ یہ شخص ایک شکاری ہے! اگر یہ شکاری گپھا کے اندر جا سکتا ہے تو میں کیوں نہیں جا سکتا؟ میں اندر چلا جاؤں گا ضرور چلا جاؤں گا۔ آخر کب تک گائیڈ کا انتظار کروں گا۔ اُف! یہ ایک گپھا ہے یا کوئی سرنگ؟ - ؟ بہت لمبی ہے۔

یہاں بہت اندھیرا ہے۔ کو۔ کو۔ کون؟ کون ہے؟ شکاری مزے کی نیند سو رہا ہے پھر وہ کون تھا؟ جو سامنے سے گزرا اور میرے جسم کو چھو کر آگے نکل گیا۔ کہیں وہ گائیڈ تو نہیں تھا؟ ارے نہیں۔ وہ باتونی آدمی میرے ایک سوال کے جواب میں پوری گیتا نہ سنا دیتا۔ پھر کون تھا وہ؟ دراصل ان گپھاؤں میں یہ پتہ نہیں چلتا کہ کس نے سوال کیا اور کس نے جواب دیا۔ کبھی کبھی تو ایسا لگتا ہے جیسے سوال کرنے والا خود ہی جواب دے رہا ہو۔ مجھے بھی ابھی ابھی کچھ ایسا ہی لگا مگر نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن اب جو میں سن رہا ہوں وہ کس کی آوازیں ہیں؟

کمال ہے کبھی ایسا لگ رہا ہے جیسے اندر کوئی مندر ہے جہاں گھنٹیاں بج رہی ہوں اور کبھی ایسا لگ رہا ہے جیسے اندر کوئی بودھ مٹھ ہے جہاں بودھ بھکشو منتر پڑھ رہے ہوں اور کبھی ایسا لگ رہا ہے جیسے اندر ایک تہہ خانہ ہے جہاں اغوا کیے گئے لوگ قید ہیں اور وہ رو رہے ہیں، چیخ رہے ہیں، چلا رہے ہیں۔ مگر اندر ہے کون؟ — ارے کوئی ہے؟ کوئی ہے۔ ایک اذیت ناک رات کٹ گئی ہے۔ اور میں گپھا کے باہر آ چکا ہوں۔ ابھی بہت سویرا ہے۔ سرد ہوائیں چل رہی ہیں۔ برف باری بند ہو چکی ہے، مگر آس پاس دھند پھیل گئی ہے۔ دُور دُور تک کچھ بھی نظر نہیں آ رہا ہے۔ اگر گائیڈ کہیں آس پاس ہو بھی تو اس کو دیکھ لینا ممکن نہیں ہے۔ لیکن جھیل کی سطح پر تیرتے ہوئے برف کے ٹکڑے صاف نظر آ رہے ہیں۔ برف کے یہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے لہروں کے ساتھ ساتھ یوں اوپر نیچے ہو رہے ہیں جیسے کوئی ان ٹکڑوں کو ہٹا کر پانی کی سطح سے باہر آنا چاہتا ہو۔ کہیں جھیل میں چھپا ہوا راکھشس باہر آنے کی کوشش تو نہیں کر رہا ہے؟ — میرا دل زور زور سے دھڑک رہا ہے۔ اور میں کبھی جھیل کے پانی میں جھانک کر دیکھتا ہوں، کبھی گپھا کے منہ کو دیکھتا ہوں اور کبھی اپنے اِرد گرد بیٹھے لوگوں کو، ان چار آدمیوں میں دو جانے پہچانے ہیں اور دو انجانے۔ ایک نوجوان وہ ہے جو سر پر کفن باندھ کر سرحد پار کرنے آیا ہے، اور دوسرا نوجوان سرحد پر ہو رہے ایک فوجی تربیتی کیمپ سے بھاگ

کر آیا ہے۔ اس کے دونوں پاؤں برف کی وجہ سے خراب ہو چکے ہیں اور وہ اچھی طرح سے جان گیا ہے کہ وہ ادھورا انسان بن کر اپنے گھر لوٹ رہا ہے۔ مگر وہ یہ نہیں جانتا ہے کہ وہ مر بھی سکتا ہے۔ یہ نوجوان ڈاکٹر بننا چاہتا تھا اور اس کے والدین یہ سمجھ رہے ہیں کہ ان کا بیٹا کالج کے ٹور پر ہے۔ میں یہ سب اس لیے جانتا ہوں کہ دونوں نوجوان میرے چھوٹے بھائی ہیں۔ تیسرا آدمی کون ہے یہ ہم میں سے کوئی نہیں جانتا ہے۔ پوشاک سے وہ جنگی قیدی لگ رہا ہے مگر وہ کون ہے کہاں کا رہنے والا ہے یہ وہ خود بھی نہیں جانتا ہے۔ وہ ڈرا ہوا ہے، سہما ہوا ہے۔ ذرا سی آہٹ سن کر یوں چونک پڑتا ہے جیسے ایک زخمی کبوتر نے بلی کے قدموں کی آہٹ سن لی ہو۔ اس کے ہاتھ پاؤں لہولہان ہیں۔ بہت خون بہہ چکا ہے۔ شاید شام تک مر جائے گا۔ اگر بچ گیا تب وہ سرحد کے اُس پار جانا چاہتا ہے یا اِس پار رہنا چاہتا ہے یہ کوئی نہیں جان سکتا ہے۔

چوتھا آدمی وہی شکاری ہے جو اپنے ساتھ ایک ہرن لے آیا ہے، وہ اس وقت بھی شیر کی طرح سویا ہے مگر ذرا سی آہٹ سن کر چونک پڑتا ہے۔ یہ آدمی ایک تاجر ہے گولیاں فروخت کرتا ہے۔ موت کا سامان بیچتا ہے، سرحدوں کے سودے کرتا ہے۔ جانوروں کی کھالیں اور انسانوں کی مجبوریاں درآمد کرتا ہے۔ وہ ہرن کے پیٹ کے اندر چھپی ہوئی کستوری کا دہی مول لیتا ہے جو انسان کے سر کی قیمت ہو۔ اس شخص نے اُس پار اور اِس پار بلکہ دنیا کے کونے کونے میں اپنا گھر بسایا ہے یا اڈہ جمایا ہے وہ اپنا ہرن لے کر چلا گیا ہوتا مگر شاید ہماری لاشوں کا انتظار کر رہا ہے۔ ! جلّاد ہے۔ جلّاد! ۔ شاید دوپہر کا وقت ہے۔ سورج کالے بادلوں کی چادر اوڑھ کر سو گیا ہے۔ یا شاید گرہن نے اسے دبوچ ڈالا ہے۔ اپنے بھائی کی حالت دیکھ کر میں بہت سخت پریشان ہوں۔ کم بخت گائیڈ آجاتا تو ہم سب اُدھر جا سکتے یا ادھر جا سکتے۔ مگر کیا کریں۔ جانے کہاں چلا گیا؟۔ ارے یہ کیا۔؟ گائیڈ پانی میں چھپ گیا ہے؟۔؟

کیوں بھئی گائیڈ کے بچے؟ ایک خطرناک بہروپیے؟۔!! تم جھیل کے اندر چھپے بیٹھے ہو۔؟ گویا تم ہی وہ راکھشس ہو جو اس جھیل کے اندر چھپا رہتا ہے؟۔ مگر یہ کیا۔؟ صورت میری جیسی اور سینگ بھینسے جیسے! دانت بھیڑیے جیسے ۔! باہر آجا۔ میں اپنا سارا گولہ بارود تم پر ختم کر دوں گا۔ تمہارے جسم کو چھلنی کر دوں گا۔ بڑی بڑی باتیں کرتا تھا۔ اور اب۔ یہ ہے تیرا اصلی

روپ ہے۔ لیکن! لیکن! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ میں جھیل کے پانی میں اپنا ہی عکس دیکھ رہا ہوں۔! تو کیا میں ہی وہ راکھشس ہوں؟۔ ہاں! ہاں!۔ شاید!۔ میں ہی تو وہ ہوں جو نوجوانوں کو سرحد پار لے جاتا ہے۔ اُف!۔ میں نے دوسروں کے گھروں میں آگ لگاتے لگاتے اپنا گھر بھی جلا ڈالا ہے۔ ہائے میرے دو بھائی!!۔ میرا کلیجہ منہ کو آرہا ہے۔ اُف! مجھے گھٹن ہو رہی ہے۔!۔ زبردست گھٹن ہو رہی ہے! گائیڈ! گائیڈ!!۔ میری آواز سن رہے ہو نا؟ شکر ہے۔ شکر ہے۔ آخر تم نے میری آواز سن لی۔ مگر یہ کس کی آواز ہے۔؟۔ ہاں۔ ہاں۔ یہ میری ہی آواز کی گونج ہے۔ مگر، مگر سنو۔ گائیڈ میری بات سن لو! لیکن تم میرے ساتھ ساتھ چلتے بھی رہے۔ بہت کچھ کہتے بھی رہے پھر کہاں غائب ہو گئے۔

سچ سچ بتا دو کیا تم بھی رشی کی طرح ایک تصور ہو یا میری طرح ایک حقیقت۔؟ بتا دو گائیڈ؟۔ بتا دو۔؟ گائیڈ؟ کیا تم مجھ سے باتیں کر رہے تھے یا میں تم سے باتیں کر رہا تھا؟ میں اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا یا پھر اپنے ضمیر کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ آس پاس کوئی نہیں ہے۔! اے میرے ضمیر۔! مجھے بتا دے کہ میں کیا کروں؟۔!! مجھے واپس لوٹ جانے کا راستہ دکھا دے۔ میں بہک گیا تھا۔ بھٹک گیا تھا۔!! مجھے بچاؤ۔ میرے گھر کو بچاؤ۔!!!
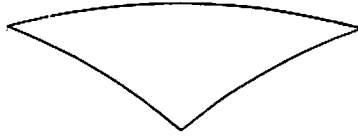
جن گلیوں میں مَیں اپنے دوستوں کے ساتھ گلی ڈنڈا کھیلا کرتا تھا آج وہ سونی سونی ہیں۔ نکڑ کے پاس وہ ویران مکان میرا گھر ہے اور ساتھ والا مکان میرے لنگوٹیا دوست روشن کا گھر ہے۔ ہمارے دوست اس نکڑ والی گلی کو روشن روشن گلی کہا کرتے تھے۔ وہ اس لیے کہ میرا نام روشن اور میرے دوست کا نام بھی روشن ہے۔ میں روشن علی اور وہ روشن کمار۔ ! اُف مگر آج اس گلی میں نہ روشن کمار رہتا ہے اور نہ میں۔ جبھی تو میں کب سے ایک اجنبی کی طرح بار بار اس گلی سے گزرتا ہوں۔ جیپ میں بیٹھے سپاہی یا کھڑکیوں سے جھانکنے والے لوگ مجھے مشکوک نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ نہ جانے میرے بارے میں کیا کیا سوچ رہے ہوں گے۔ صحیح بات تو یہ ہے کہ میں اس وقت اس انسان کا گھر تلاش کر رہا ہوں جو میرے ساتھ چلتے چلتے سرِ راہ گولی کا شکار ہو کر گر پڑا تھا۔ جس نے اپنے خون سے لت پت ہاتھوں سے میرے ہاتھوں میں اپنے والدین کے لیے کھانسی کی دوائی تھما کر یہ کہا تھا کہ دوائی اس کے گھر پہنچا دوں۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ دوائی کو جیب میں رکھ کر مجھے پہلے اس اجنبی دوست کو کندھے پر اٹھا کر شمشان گھاٹ لے جانا پڑے گا۔

حالانکہ شہر میں کرفیو ہے لیکن اندرونِ شہر کی گلی کوچوں میں چلنے پھرنے سے کوئی نہیں روک رہا ہے۔ اگر کوئی روک رہا ہے تو وہ ہے دہشت۔ ! میں بھی ڈرا ڈرا سا ہوں مگر سوچ رہا ہوں کہ اپنے ہی شہر گلیوں میں چلتے چلتے کس کا ڈر ! کس کا خوف ؟ سبھی اپنے ہی تو ہیں۔ مگر کیا یہ میرا وہم ہے ؟ اگر ایسا نہیں تو مجھے کوئی کیوں نہیں پہچان رہا ہے۔ ! کیوں آخر کیوں ؟ ؟

اُف ! یہاں سوال کرنے والے بہت ہیں اور جواب دینے والا کوئی نہیں۔ ؟ اس لیے میں بس چلتا رہتا ہوں۔ ایک محلے سے نکل کر دوسرے محلے میں جاتا ہوں۔ ایک گلی سے نکل کر دوسری گلی میں داخل ہو کر سردی سے ٹھٹھرتا ہوا۔ بار بار کی لُو کا لُوکی سے لرزتا ہوا۔ حالانکہ نہ میرے پاس کوئی پوسٹر ہے۔ نہ کوئی

ٹیپ ہے اور نہ ہی کوئی ریوالور یا بندوق۔ جیب میں کھانسی کی دوائی ہے۔ بس اور کچھ نہیں۔ پھر بھی اُف! کیا میں پل دو پل کہیں رک نہیں سکتا۔؟

اسکول کے آنگن میں چند بچے سردی اور ٹھنڈ کے باوجود خوب ہنس رہے ہیں اور اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے زمین سے برف کے گولے اٹھا کر ایک برف کا بت بنا رہے ہیں۔ یہ بن گئی ناک، یہ کان۔ یہ بازو۔ یہ آنکھیں لیکن ٹانگیں نہیں ہیں۔ بھاگے گا کیسے ؟ گولی لگ گئی تو مر جائے گا۔

بچے ہنس رہے ہیں۔ اور بت کو مختلف نام دے کر قہقہے لگا رہے ہیں لیکن میں نے جب بت کو قریب جا کر دیکھا تو یوں لگا جیسے ایک ماں کی گود رکھا ٹیسٹ ٹیوب بچہ ہے۔ مجھے قریب آتے دیکھ کر بچوں کو گویا سانپ سونگھ گیا۔ جیسے کسی نے بٹن دبا کر ان کی ہنسی کو دبوچ ڈالا۔ وہ سب بھاگ گئے اور میں بھی ان کے چھوڑے ہوئے قدموں کے نشانات کے پیچھے پیچھے چل کر اسکول کے احاطے سے باہر نکلا۔

میرے قدم ایک بہت بڑے مکان کے سامنے رک گئے۔ بہت سارے لوگوں کو ایک ساتھ دیکھ کر کچھ کچھ گھبرا گیا اور کچھ کچھ خوش بھی ہوا۔ وہ اس لیئے کہ وہ سب خوش نظر آ رہے تھے۔ وہ اپنے اپنے کام میں حد سے زیادہ دلچسپی لے رہے تھے۔ دراصل وہ کاٹھ اور کاغذ کا ایک پتلا بنا رہے تھے۔ اس پتلے کو انہوں نے ایک نام دے رکھا تھا اور ان کی کوشش تھی کہ پتلا بہت ہی اچھا بنے۔ کسی شخص کے خلاف نہایت زہریلی الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے وہ یہ بھی کہہ رہے تھے۔ یہ رہی ناک۔ یہ کان۔ یہ آنکھیں۔ یہ بازو۔ اور یہ سالے کا منہ۔ ڈال دو کتے کے منہ میں یہ جوتا تاکہ کچھ بول ہی نہ سکے۔ جب کل صبح چوک میں جلا دیں گے تب بھی سالا ایسے ہی چپ چپ نظر آئے سب لوگ غصے سے بھڑک اٹھے اور اپنے ہی بنائے ہوئے کاٹھ کے پتلے کو ٹھوکریں مارتے رہے۔ اچانک وہ مصور جس نے پتلے کا چہرہ رنگ دیا تھا، چلانے لگا۔ یہ کیا کیا جاہلو۔! بمشکل سے آنکھیں بنائی تھیں۔ تم نے مٹا دیں اب بناؤں تو رنگ سوکھے گا بھی نہیں۔ تقریباً سبھی لوگوں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ مجھے گھور گھور کر یوں دیکھنے لگے جیسے میں ان سب کے نام موت کا پیغام لے کر آیا تھا۔

پھر مکانوں کے اندر ایک ساتھ کئی دروازوں کے بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ اندر سے کسی عورت کی آواز سنائی دی۔

کیا پھر سے تلاشی لینے آئے ہیں۔؟ کیا پھر سے لڑکیوں کو تہہ خانے میں چھپانا ہوگا۔ یہ کیسا شہر ہے؟

اچانک خاموشی چھا گئی۔ اور میں بے بس ہو کر وہاں سے چل پڑا۔

ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں زخمی لوگ کراہ رہے تھے۔ تو مجھے بھی اپنے بازو سے بہتا ہوا خون نظر آیا۔ کراس فائرنگ میں کسی کی ٹانگ کٹ گئی تھی اور کسی کی آنکھیں بے نور ہو گئی تھیں۔ سوچا خون بے شک بہتا رہے۔ مگر ہسپتال کی لال لال رنگ کی کمبلوں سے لپٹ کر اپنے ٹھٹھرتے بدن کو تھوڑی گرمی دو۔ چاہتے ہوئے بھی ایسا نہیں کر پایا۔ ڈاکٹر لوگ پریشان تھے کہ جو عورت ٹیسٹ ٹیوب بچے کو جنم دے رہی ہے اس کو کون سا بیڈ دیا جائے کیونکہ اس کے لیے رکھا کمرہ چند زخمی دہشت گردوں کی کڑی نگہبانی کرنے والی پولیس ٹیم کو دیا گیا تھا۔

سردی سے اپنے سکڑتے ہوئے جسم کو تقریباً گیلی چادر سے ڈھانپ کر میں نے ہسپتال سے نکل کر ہوٹل میں جانا چاہا تو ایک سپاہی نے سختی سے ٹوک کر کہا، کہاں جا رہے ہو؟ جانتے نہیں شہر میں کرفیو ہے؟

کیا چھپا رکھا ہے اس کمبل میں۔؟ ہاتھ اوپر اٹھا دو ورنہ گولی مار دوں گا۔!

گیلی کمبل دور پھینک میں اچھل کر تاریک گلی میں داخل ہوا تو سپاہی کی آوازیں میرا تعاقب کرنے لگیں۔ خبردار۔ ایک دہشت گرد بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی گولیوں کی آوازیں سنائی دیں۔

سڑک کے اجالوں سے بھاگ کر مجھے گلی کی تاریکیوں نے اپنے آغوش میں نہ لیا ہوتا تو میں مارا گیا ہوتا۔ ہانپتے اور کانپتے ہوئے میں نے ایک پھاٹک کھٹکھٹائی تو کسی نے سرگوشیانہ آواز میں کہا۔ گھبراؤ نہیں۔ یہ محفوظ جگہ ہے۔ دروازہ بند کر دو اور اندر چلے آؤ۔ تمہارے ساتھی پکڑے گئے کیا۔ کام ہوا یا نہیں؟ جب وہ شخص میرے بالکل قریب آیا تو ہم دونوں کو ہی حیرت ہوئی۔ نہ وہ مجھے جانتا تھا اور

نہ میں اس کو جانتا تھا۔

میری چھاتی پر بندوق رکھ کر وہ گرجنے لگا۔کون ہو تم۔ جاسوس یا مخبر۔؟
اس سے پہلے کہ میں کچھ کہہ پاتا ایک زوردار دھماکہ ہوا۔مکان کی ساری بتیاں بجھ گئیں ایک فاتحانہ قہقہہ گونج اٹھا۔لو کام بن گیا۔ٹرانسفارمر اڑا دیا گیا۔

میں وہاں سے کیسے نکل آیا یہ مجھے معلوم نہیں۔لیکن ایک اندھیری گلی سے نکل کر دوسری گلی میں جاتا رہا ہوں۔ایک دکان کے بند گیٹ سے ٹکرا کر دوسرے مکان کی پھاٹک کو کھٹکھٹاتا رہا اور آخر ایک دروازہ کھلا۔ایک بزرگ میرے چہرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھتا رہا۔نہ کوئی سوال۔نہ کوئی جواب۔ میں اس کے پیچھے پیچھے چل کر اندر چلا گیا۔

ایک بہت بڑے مکان کے بہت بڑے ڈرائنگ روم میں ہم تین شخص ہیں۔ایک بوڑھا ایک بڑھیا اور میں۔میاں بیوی کے چہرے یوں لگ رہے ہیں جیسے یخ بستہ جھیل۔بوڑھا ایک سفید کپڑا سی رہا ہے اور بڑھیا نے جب میرے شانوں پر ایک کمبل ڈال دیا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ایک مردے کے اندر روح ڈال دی گئی ہو اور بڑھیا کی مرجھائی ہوئی آنکھوں میں مجھے زندگی کی کرن دکھائی دی۔۔ بڑھیا نے گرم گرم قہوہ پلایا تو میرے ٹھٹھرے ہوئے دانت سنبھل گئے۔اپنائیت کا احساس دلانے والوں سے میں نے کئی سوالات کیے مگر جواباً صرف اتنا جان پایا کہ عمر رسیدہ والدین کا اکلوتا بیٹا کل اس فائرنگ میں مارا گیا ہے اور اطلاع ملی ہے کہ لاش ہسپتال سے کل بھیجی جائے گی۔یہ جان کر کلیجہ پھٹ گیا کہ بدنصیب باپ اپنے جوان بیٹے کا کفن تیار کر رہا ہے تاکہ انتم سنسکار میں کرفیو کوئی روکاوٹ نہ ڈال سکے۔

رات یونہی گزر گئی ہے۔سچ پوچھو تو سسکتے سسکتے آج صبح سویرے جب میں نے کھڑکی کھولی تو باہر زبردست برف باری ہو رہی تھی۔زمین پر بچھی برف کی چادر پر نہ قدم کے نشان تھے اور نہ گاڑیوں کے پہیوں کے نشانات اسکول کے احاطے میں بچوں کے بنائے ہوئے برف کے بت پر برف کی ایک موٹی تہہ جمع ہو گئی تھی۔بت کے بجائے وہ ایک تودہ دکھائی دے رہا تھا۔ چوک میں کسی کا پتلا جلانے والے بھی نظر نہیں آ رہے ہیں۔غالباً بندوق والے بھی مزے کی نیند سو رہے ہیں۔اس کمرے کے ایک کونے میں بوڑھا اور بڑھیا دونوں رنج و غم میں ڈوبے ہوئے بار بار کفن

کو یوں چھو رہے ہیں گویا اپنے بیٹے کے منہ سے لحاف ہٹا کر کہہ رہے ہوں۔ اٹھو بیٹے۔ دیر ہوئی ہے۔ باہر خاموشی ہے۔ پاس کے مکان سے آرہی ریڈیو کی مدہم مدہم آواز خاموشی کو گاہے بگاہے توڑ رہی ہے۔ سننے والا شاید کوئی دوسرا اسٹیشن پکڑنے کی کوشش کر رہا ہے اس لیے پوری خبریں سنائی نہیں دے رہی ہیں۔ ہاں اتنا سن چکا ہوں کہ کل رات کراس فائرنگ اور بم دھماکوں سے چار آدمی مارے گئے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی سن پایا کہ شہر کے صدر ہسپتال میں پہلی بار ایک ٹیسٹ ٹیوب بچے نے جنم لیا ہے۔ اچانک ٹیلیفون کی گھنٹی بج اٹھی تو فون میں نے ہی اٹھایا پولیس نے اطلاع دی کہ مرنے والوں میں بوڑھے بزرگ کا بیٹا شامل نہیں ہے۔ یہ خبر جب میں نے بوڑھے اور بڑھیا کو دی تو یوں لگا جیسے ایک جھیل کی لہریں چمکتی دھوپ میں مچلنے لگی ہوں گویا خوشی اور مسرت سے آکاش کو چھو لینے کی کوشش کر رہی ہوں۔

میری بھی یہی کیفیت اگر میری نظریں اچانک بوڑھے کے ہاتھ میں رکھی کسی تصویر پہ نہ رک جاتی۔ اف، خدایا۔ یہ تو وہی خوبرو شخص ہے جو اس وقت بھی بین الاقوامی بھائی چارے کی باتیں کر رہا تھا جب اس کے سینے میں گولی لگ گئی تھی۔ اف۔ اف۔

بوڑھا ہنستے ہنستے کھانس پڑا تو میرا ہاتھ جیب میں رکھی ہوئی کھانسی کی دوائی کی طرف گیا جو اس کے مرحوم بیٹے نے مجھے دی تھی۔ اُف اس کا نام بھی روشن ہی تھا۔ اروشن کے ساتھ روشنی بھی گئی گیا، اُف۔ یہ تاریکیاں۔!!

مگر کب
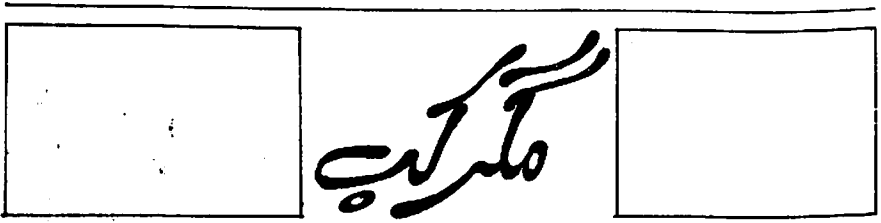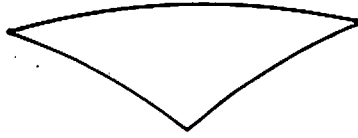
اچانک یہ سب کیسے ہو گیا۔کیوں ہو گیا؟ مگر میں یہاں آیا کیسے؟ کون لے آیا مجھے یہاں؟
میں یہاں تنہا ہوں یا تنہائیوں میں رہنے والوں میں سے ایک ہوں ۔اُف! کوئی تو جواب دو؟
خدایا یہ ایک طویل وقفہ ہے یا کبھی نہ ختم ہونے والی خاموشی ہے ۔کس قدر ڈراؤنی ہے یہ خاموشی! کون
سی جگہ ہے یہ؟ کوئی تو بتا دو! یہ زمین کا کوئی حصّہ ہے یا آسمان کا ٹکڑا، شاید دونوں میں سے ایک
بھی نہیں۔ظاہر ہے نہ کہیں کوئی انسان نظر آرہا ہے اور نہ ہی کہیں کوئی دیوتا یا بھگوان دکھائی دے
رہا ہے اور اگر یہ پاتال ہوتا تب بھی کہیں درختوں کی جڑیں نظر آتیں۔
یا پھر زمین کے اندر رہنے والے سانپ دکھائی دیتے ہاں ہاں اتنا نا سمجھ نہیں، جانتا ہوں کہ
اندھیرے میں کچھ بھی نظر نہیں آتا مگر رینگتے ہوئے سانپوں کی سنسناہٹ تو محسوس کر سکتا نا؟
مگر؟ مگر!۔مگر وہ ۔ وہاں ۔آہا ۔ وہاں سنسناہٹ تو ہو رہی ہے ۔کون ہے وہاں؟ مجھے
کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے ۔ اندھا ہو گیا ہوں کیا؟ یا میرے گرد و پیش ہر شے نے کالی چادر
اوڑھ لی ہے ۔مگر یہ جگہ ہے کہاں؟!۔ اُف یہ آنکھ جھپکتے ہی میں کہاں سے کہاں آ گیا ہوں۔
جانا کہاں تھا اور آ کہاں گئے۔اُف! بیوی نے کہا تھا کہ بٹیا کی شادی کی تاریخ پکی کر کے شام کو لوٹ
کر آ جانا ۔ہا۔ہا۔ہا ۔میری بیوی کو نانی بن جانے کا کتنا شوق ہے ۔سچی بات بتا دوں۔میں بھی یہی چاہتا
ہوں کہ میرے خاندان کا تناور درخت کسی بھی حالت میں بے شجر اور بے ثمر نہ رہے۔سوکھے پیڑ تو ہوا کے
جھونکے کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتے ۔آندھی اور طوفان کو کیسے روکیں گے ۔ارے رہنے بھی دو ایسی باتیں
تو ایک دانشور ہی نہیں بلکہ ایک عام آدمی بھی کرتا ہے ۔روشن لال بھی ۔روشن علی بھی اور روشن سنگھ
بھی ۔مگر میں کس سے باتیں کر رہا ہوں ۔آس پاس تو کوئی بھی نہیں ہے ۔ارے ہاں یاد آیا۔وہ
انگوٹھی نہیں مل رہی ہے جو میں نے اپنے ہونے والے داماد کو پہنانی ہے ۔جیب میں تو نہیں ہے۔

کہاں گر گئی؟ مگر میری جیب بھی تو کوئی کاٹ گیا ہے۔ اف میرے کپڑے بھی کسی نے اتار دیے ہیں۔ مگر
کیوں؟ آخر کون ہے جس نے مجھے الف ننگا کر کے یہاں بھیج دیا ہے۔ ارے کمال ہے۔ میں کب سے
چلا رہا ہوں اور کوئی جواب نہیں دے رہا ہے۔ لگتا ہے یہ کوئی کھنڈر ہے۔ نہیں نہیں۔ کھنڈر زمین
پر ہوتے ہیں۔ یہ کوئی زمین کا حصہ نہیں ہے۔ خلا ہے شاید۔ ؟ میں خلاؤں میں گھور گھور کر دیکھ سکتا
ہوں لیکن خلاؤں میں رہ نہیں سکتا۔ میں کیا کوئی بھی نہیں رہ سکتا۔ مگر۔ ؟ مگر کوئی تو ہے یہاں۔
آس پاس۔ ! وہاں جھاڑیاں ہیں یا بادلوں کے ٹکڑے ہیں؟ اف یہ تاریکیاں ہی شاید شیطان کا روپ
ہیں۔ کم بخت کچھ دیکھنے ہی نہیں دے رہا ہے۔ نہ کسی کا چہرہ اور نہ کسی کے پاؤں۔ تو کیا مجھے شیطان
یہاں لے آیا ہے۔ ! ڈر نہیں لگتا اسے بھگوان۔ ؟ ہا۔ ہا۔ ہا۔ گویا بھگوان سب سے زیادہ طاقتور
نہیں ہے۔ پھر کون ہے سب سے طاقتور۔ ؟ ہش! ہش! یہ کس کی آواز ہے۔ ؟ ہاں۔ ہاں۔ وہی
آواز دبی دبی سی کیوں ہے؟ میں نے تمہاری آواز پہچان لی ہے بوڑھی اماں! ۔ ! مگر تم۔ تم رو کیوں
رہی ہو؟ کیا تمہیں کسی جن نے اس تاریک غار میں قید کر دیا ہے؟ کیا کہا۔ یہ غار نہیں ہے۔ کال
کوٹھری بھی نہیں ہے کیا؟ ۔ پھر۔ اچھا یہ تو بتا دو کہ تم مجھے دیکھ سکتی ہو کیا؟ ۔ نہیں۔ پھر؟ اچھا یہ بتا دو
کہ تم رو بھی رہی ہو ہنس بھی رہی ہو۔ کہیں اس لیے تو نہیں ہنس رہی ہو کہ ابھی جن آ جائے گا اور مجھے
کھا جائے گا۔ ایک آنکھ والا جن ہے کیا۔ ؟ اگر جن بھوت بھی یہاں نہیں ہیں تو کون رہتا ہے یہاں۔
وہ دیکھو۔ وہ دیکھو۔ تاریکیوں کو چیرتے ہوئے چند دھندلے دھندلے خاکے میرے قریب آ رہے
ہیں لگتا ہے میں اندھا نہیں ہوا ہوں۔ فقط میری نظر دھندلا گئی ہے۔ دھواں لگ گیا ہے نا۔
نہیں نہیں۔ اگربتی کا دھواں نہیں۔ بارود کا دھواں۔ دراصل جب میں نے ایک بھیانک
آواز سُنی تھی تب مجھے آنکھیں بند رکھنی چاہیے تھیں۔ کھلی رکھی تھیں اس لیے شاید میری بینائی کمزور
ہو گئی ہے۔ مگر۔ مگر۔ ایک بات ہے۔ اگر دھواں زہریلا تھا تو آواز بھی بھیانک تھی۔ میرے کانوں
کے پردے پھٹ کیوں نہیں گئے۔ میں سرگوشیانہ انداز میں کہی بات بھی سن رہا ہوں۔ یا پھر یہ ہو سکتا ہے
کہ کہنے والے چلا چلا کر کہے جا رہے ہوں اور میں بھی۔ ارے یہ آواز تو اس لڑکے کی آواز ہے جو بس میں میرے
ساتھ بیٹھا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ وہ کوئی انجینیر ہے۔ اور دریا کا رخ بدل کر ڈیم بنانے جا رہا ہے۔ کتنی
دلکش آواز تھی اس کی۔ لیکن اب آواز دے کر کچھ کہہ کیوں نہیں پاتا۔ یا پھر۔ شاید۔ میں ہی اس کی

آواز نہیں سن سکتا۔ مگر میں آواز سن تو رہا ہوں۔ وہی دلکش آواز۔ گویا کوئی رشی کوئی دھارمک کہانی
سنا رہا ہو۔ کون ہے یہ۔ میں کیسے بتا سکتا ہوں بوڑھی اماں۔ ہاں یہ بتا سکتا ہوں کہ وہ کہہ رہا ہے۔
مگر ایک شرط پر۔ وہ یہ کہ تم مجھے یہاں سے فرار ہو جانے کا راستہ بتا دوگی۔ بتا دوگی نا۔ ؟۔ وعدہ ؟ ٹھیک
ہے تم وعدہ کر رہی ہو تو بتا دیتا ہوں۔ شکل دکھائی نہیں دے رہی ہے اس لیے مجھے کیا معلوم کون ہے
یہ۔ ہاں سب سے پہلے یہ کہہ گیا ہے کہ کوئی جن یا بھوت اس کے تابع نہیں ہے اس لئے فرار کا راستہ
نہیں بتا سکتا ہے۔ نا بتا ئے۔ میرا کیا۔ تمہاری انگلی پکڑ کر راستہ تلاش کر لو۔ ں گا۔ بٹیا کی شادی کی تاریخ جو
پکی کرنی ہے۔ ہاں۔ ہاں۔ بتا دیتا ہوں کہ کیا کہہ رہا ہے۔ کہہ رہا ہے جن لوگوں نے اس کو صلیب
پر چڑھایا تھا وہ نادان تھے۔ نہیں جانتے تھے کہ وہ کیا کر رہے تھے۔ میں نے پوچھا کہ تم نے روکا کیوں
نہیں۔ تو کہہ گیا کہ اس زمین پر اس کا خون گرنا نہایت ضروری تھا۔ آدم ذات کی بہبودی کی خاطر۔
ہا۔ ہا۔ ہا۔ یہ غلط فہمی ہے نا اس کی خوش فہمی۔ انسان کو سمجھ ہی نہیں پایا ہے تو جہان میں آ کر
سمجھا بھی تو۔ ؟ ہا۔ ہا۔ ہا۔ ارے ہنسی روک بھی لوں تو رکتی نہیں۔ اگر زمین میں جذب ہونے والا
خون جوالا بن کر نکل جاتا تب کس کی ہمت تھی جو زمین پر خون گراتا۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔ اور سن لو بوڑھی اماں!
کہہ گیا ہے کہ تاریک رات کو نئی صبح دبوچ کر نکل جائے گی۔ مگر۔ مگر۔ بوڑھی اماں کیا وہ کوئی فرشتہ تھا۔
ہونہہ۔ اگر ہوتا تب صلیب پر کیوں چڑھ جاتا۔ ؟؟۔ ؟ ہش! ہش۔ کوئی اور قریب آ رہا ہے۔ ہاں۔
ہاں۔ یہ میرا وہم نہیں ہے۔ بلکہ کسی کے قدموں کی آہٹ ہے۔ ہاں۔ ہاں۔ !؟۔ !؟۔ لو سن لو بوڑھی
ماں میں نے کتنے ہی سوالات پوچھ لیے اور وہ فقط اتنا کہہ گیا کہ اس کو زہر کا پیالہ پلایا گیا۔ وہ سب کچھ
جانتے ہوتے بھی خوشی خوشی پی گیا۔ کہہ گیا ہے کہ اسے فخر ہے وہ کسی مقصد کی خاطر شہید ہو گیا۔ کیا
یہی دانشوروں کے مقاصد کا مطلب ہوتا ہے۔ ؟۔ بوڑھی اماں یہ یونان کہاں ہے ؟ ہا۔ ہا۔ ہا۔
یہ بھگوان بھی بڑا دہ ہے۔ زمین پر کہیں بھارت کہیں ایران۔ کہیں روس اور کہیں یونان بنا ڈالا
ہے۔ مگر جب کالی کوٹھری میں ڈالنے کی بات آ گئی تو سب کو ایک ہی جگہ رکھ دیا۔ کوئی بھی امتیاز نہیں۔
ہونہہ۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔ ہو۔ ہو ہو۔ کیا ؟ کیا۔ کیا کہا بوڑھی اماں تمہیں میرے قہقہوں میں رونے کی
آواز سنائی دے رہی ہے کیا ؟ اری اماں۔ یہ آواز میری آواز نہیں ہے۔ میں بھلا کہاں سسک
رہا ہوں۔ یہ تو وہ ہے۔ نام کیسے بتا دوں چہرہ نظر آئے تو جان سکو۔ خیر یہ رونے کی آواز کسی جوان مرد

کی ہے۔کہہ رہا تھا کہ وہ معمار تھا۔سنگ تراش تھا۔محل بھی بنا چکا ہے اور مقبرے بھی۔پھر شہنشاہ نے حکم دیا کہ شہزادے کی محبوبہ کو زندہ دفن کر دو۔۔۔ بے چارہ حکم کی تعمیل نہیں کرتا تو اس کا سر قلم کیا جاتا۔زندگی پیاری تھی اس لیے رقاصہ کو پائل سمیت دفن کر دیا۔پھر جب شہزادہ بادشاہ بن گیا تو اس نے اپنی اوّلین فرصت میں اس کا سر ایک پتھر پر رکھوا کر ایک ہاتھی کے وزنی پیر سے کچلوا ڈالا۔کہہ رہا ہے اسی روز اس کے گھر میں ایک بچہ پیدا ہوا تھا۔اب رو رو کر پوچھ رہا ہے کہ کوئی تو اسے بتا دے کہ اس کے بیٹے نے بادشاہ کا سر قلم کر دیا تھا۔کیا بادشاہت ختم ہو چکی ہے؟ کیا جواب دوں۔تم بتا دو بوڑھی اماں۔

بوڑھی اماں دیکھو تو کون ہے کیا تم نے آواز نہیں پہچان لی۔؟۔ہاں۔ہاں۔وہی تو ہے۔کہہ رہا ہے کہ جب اس نے بدیشی سرکار کا پرچم اڑا دیا تھا تب دشمن نے پیٹھ پر گولی ماری تھی۔پوچھ رہا ہے کہ کیا اس کے خون کے ایک ایک قطرے سے لاکھوں مجاہدین پیدا ہوئے ہیں۔؟۔ان کے بارے میں پوچھ رہا ہے کہ وہ کیسے ہیں۔کیا کر رہے ہیں آج کل۔!کیا جواب دوں۔!!؟۔ارے واہ ان کے ساتھ ایک کارواں ہے۔کوئی فرانسیسی، کوئی روسی، کوئی چینی، کوئی افریقی۔ہاں۔ہاں ہندوستانی بھی تو ہے۔ ہاں سب ایک ہی سوال پوچھ رہے ہیں۔کیا جواب دوں۔سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ دنیا کی تباہی کا آغاز کہاں سے ہوا ہے اور اب اختتام کہاں ہوگا۔ارے یہ کیا؟ یہ کیا۔؟ بوڑھی اماں تم رو رہی ہو کیوں؟ مانا کہ یہ عورتوں کا ہتھیار ہے مگر اس تجسس کو ختم کرنے کا کوئی اور حل نظر بھی نہیں آرہا ہے کیسے جان لیں گے ہم۔؟ اچھا اچھا تم میرے انجام پر رو رہی ہو۔!ارے یہ کیا ایک اور ماں ہے جو رو رو کر اپنے بیٹے سے سوالات کر رہی ہے۔ہاں میں ان کی گفتگو سن چکا ہوں۔بیٹا ہنس کر کہہ رہا تھا ماں۔ شیر کی ماں شیرنی ہوتی ہے اور سنو۔جب میرے چہرے پر جلّاد نے کالا کپڑا اڑا دیا تھا۔تب سانس ٹوٹنے سے پہلے مجھے ایک آزاد ملک کی جنم کنڈلی نظر آتی تھی جاتے جاتے یہ پوچھ رہا تھا کہ آزاد ملک میں کالی جھنڈیاں ہاتھ میں لیے کون کس کے خلاف مظاہرہ کر رہے ہیں؟ اور کیوں۔؟۔بوڑھی اماں تم ہی بتا دو کہ کیا کہوں اور کیا نہ کہوں۔اور کہوں بھی تو کیسے کہوں؟ کچھ کہا نہیں جاتا اور چپ رہا نہیں جاتا مگر تم تو کہہ سکتی ہو نا۔!۔؟ بوڑھی اماں!۔بوڑھی اماں!!۔۔!!

چلی گئی میں جانتا تھا کہ فرار کا راستہ بتائے بغیر چلی جائے گی۔بوڑھی اماں! میں نے سوچا کہ تم چلی گئی۔بوڑھی اماں مجھے فرار ہونے کا راستہ بتا دو۔انہیں میں ہمالیہ کی وادیوں میں نہیں جانا چاہتا

سمادھی لگا کر نہیں بیٹھ جانا چاہتا
ہوں، تپسیا نہیں کرنا چاہتا ہوں۔ برگد کے پیڑ کے نیچے میں
ہوں۔ ارے یہ کون۔ ارے لڑکے تم کہاں تھے۔ اور اب کیسے نمودار ہو گئے تم۔ تم خاموش ہو جاؤ۔ میں
بوڑھی اماں سے بات کر رہا ہوں۔ ارے بچے ان کی بات رہنے دو جانے کون تھے وہ لوگ۔ کبھی منہ
میں مٹھی بھر نمک ڈال کر آواز کو دبوچ لیتے ہیں اور پھر مٹھی بھر مرچیاں آنکھوں میں ڈال کر ہتھیلیوں میں
آگ لگاتے ہیں۔ منہ بھی کھلا ہے۔ آنکھیں بھی کھلی ہیں۔ مگر آواز نہیں۔ بینائی نہیں۔ کیا کہہ رہے
ہو تم۔؟ ہاں۔ ہاں۔ مجھے معلوم ہے کہ گولیاں چلائی گئی تھیں۔ ہاں۔ ہاں۔ یہ بھی یاد ہے کہ اس وقت
ہم تواریخ پر بحث کر رہے تھے۔ میں نے کہا تھا کہ ایک مہاراجہ نے اپنی محبوبہ حاصل کرنے کے لیے
گھمسان کی لڑائی لڑی تھی۔ اور دوسرے نے شہرت حاصل کرنے کے لیے ہزاروں عورتوں کی مانگ
کو اجاڑ دیا تھا۔ لاکھوں بچّوں کو یتیم بنا ڈالا تھا۔ پھر ہم کھڑکی سے جھانک کر اپنے آزاد ملک کے کھیت
دیکھتے رہے۔ خوشیوں کی مہک دیکھتے رہے اور گندم کی مہک سونگھتے رہے۔ ہمارے ہاتھ میں کوئی
کتاب تھی۔ اور میرے پاس ایک پھول کا گلدستہ ـــ ایک انگوٹھی اور بھگوان کی تصویر تھی۔ پھر ہم نے
ایک آواز سُنی تھی۔ پھر کئی آوازیں۔ گولیوں کی بوچھاڑ۔ میں دھڑام سے گر گیا تھا۔ اور تم؟ کیا
اس وقت بھی تمہارے ہاتھ پاؤں بے حس ہیں؟ کہاں جا رہے تھے تم۔؟۔ کیا؟! ۔ کیا؟! ــ تو
کیا تم وہی لڑکے ہو جس کے ساتھ میری بیٹی کی شادی طے ہوئی تھی۔! بیٹے یہ سب کیوں ہوا۔؟۔
بیٹے تمہارا کیا قصور تھا۔؟ قصور تو میرا بھی کوئی نہ تھا بچّوں کو تاریخ پڑھاتا ہوں۔ یہ کیا قصور ہے
میرا؟۔ میری بات رہنے دو۔ تم بتا دو کیا یہ دھرتی تمہارے خون کی پیاسی تھی۔؟۔ کیا تم بھی کوئی
مسیح، سقراط، مجاہد، معمار یا مظلوم ہو۔؟ پھر کیوں مار ڈالا گیا تمہیں؟۔ ؟۔ ارے بیٹے رو نہیں پڑوں
تو کیا کروں۔ میری بیٹی تو جیتے جی مر گئی۔ اور اس کی ماں بے موت مر گئی۔ ایک تناور درخت گر گیا
بیٹے۔! اور وہ جل رہا ہے ہماری چتاؤں کے ساتھ۔!! ہاں ہاں بیٹے یہ بو تمہارے جلتے ہوئے گوشت
کی بو ہے۔ میرے گوشت کی بو بھی ہے۔ درخت کے جلنے کی بو بھی ہے۔! بیٹے میں راکھ میں ڈوبا جا رہا
ہوں۔ ایک سوال پوچھوں گا تم سے۔ مجھے جواب نہیں دینا چاہتے ہو تو نا سہی۔ مگر بوڑھی اماں کو ضرور
بتا دینا۔ ہاں مجھے بھی سنا دو تو بہتر۔ ہاں تو بیٹے فقط اتنا بتا دو کہ کیا تمہارے خون سے بھی لاکھوں مجاہدین
پیدا ہوں گے۔ لیکن کب؟ لیکن کب؟۔ ؟؟؟

●●
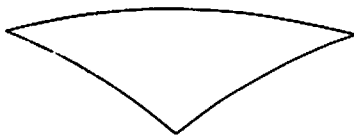
دیکھتے ہی دیکھتے یہ کیا سے کیا ہوگیا! کبھی آس پاس ڈراؤنی خاموشی چھا جاتی ہے اور کبھی چونکا دینے والا شور برپا ہو جاتا ہے۔

اس شور و غل میں اس کے چیخنے چلانے کی آوازیں بھی ہیں۔ آخر وہ کرے بھی تو کیا۔ اپنے لب سی لینا چاہتی ہے تو آنکھیں ٹوٹے باندھ کی طرح بہتی رہتی ہیں۔ آنسو روک لینا چاہتی ہے تو تھرتھراتے ہونٹ یوں نظر آتے ہیں جیسے گرج کے بعد ایک دوسرے سے ٹکرائے ہوئے بادلوں کے مضطرب ٹکڑے۔ شاید اسی لیے وہ اپنے آپ سے گھبرا کر مر جانا چاہتی ہے۔ مگر حالات اس کو نہ مرنے دے رہے ہیں اور نہ جینے دے رہے ہیں۔

چند روز پہلے پدما بھوشن کو شہر والے تو کیا، اڑوس پڑوس والے بھی نہیں جانتے تھے۔ جانتے بھی کیسے؟ کسی کے ساتھ میل جول، دعا سلام، آنا جانا ہوتا تب نا؟ پڑوسیوں کے لیے وہ پچھلے پندرہ سال سے ایک پہیلی بن گئی ہے۔ شاید اسی لیے اب کوئی اس کو جاننے کی کوشش بھی نہیں کرتا تھا ہاں کبھی کبھار جب وہ اپنے رئیس بوڑھے شوہر برج بھوشن کے ساتھ باغ میں ٹہلتی ہوئی نظر آتی تھی تو جملہ نکلنے والے کے منہ سے بے ساختہ نکل جاتا۔ ہائے یہ میاں بیوی ہیں یا باپ بیٹی؟ اس بے ربطہ کہ بیوی حسین اور جوان جب کہ مرد بد صورت اور ڈھیلا ڈھالا۔ پھر بھی جب بھی کبھی وہ ادھر ادھر نظر آتی تب وہ اپنے شوہر کے ساتھ ہی قدم سے قدم ملا کر چلتی پھرتی نظر آتی ورنہ پھر پری چہرہ عورت اپنے محل نما مکان کے اندر ہی رہتی تھی۔ پھر اگر کوئی مکان، کاریگر، مزدور، دودھ والا، گیس والا گھر میں آتا جاتا بھی تھا تو مالکن کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھ پاتا تھا مگر آج پردے میں رہنے والی اور عام لوگوں سے الگ تھلگ رہنے والی اس عورت کو سارا شہر اخباروں میں چھپی سرخیوں کے ساتھ دیکھ چکا ہے۔ آج یہ عورت پولیس کے لاک اپ میں یوں نظر آرہی ہے جیسے چڑیا گھر میں نمائش کے لیے رکھا ہوا ایک

خونخوار درندہ۔

اس کی قربت میں رہنے والی اس کی پسندیدہ نوکرانی رادھا نے شاید خواب میں بھی نہیں سوچا ہوگا کہ وہ بھی اس کا چہرہ دیکھ کر خوف زدہ ہو جائے گی۔ شاید وہ درزی جس کے ہاتھ پدما کے سنگِ مرمر جیسے بدن کا ناپ لیتے ہوئے کانپ جاتے تھے، یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آج اسی بدن پر زخم آئیں گے اور وہ خود ہی اپنے ناخونوں سے اپنے شاداب سینے کو کھرچ کھرچ کر لہولہان کرتی رہے گی۔

شاید پدما کچھ کر بھی نہیں سکتی ہے۔ یہ سب دیکھ کر ہی تو پولیس والے اس کے چیخنے چلانے سائرن کا اشارہ سمجھ کر کسی کو بھی اس کے قریب نہیں جانے دیتے۔ بلکہ یہ سمجھ کر کہ دورے کی شدت زیادہ ہے وہ برج بھوشن کو بھی دور دور رہنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ یہ سوچ کر کہیں پدما کچھ کر بیٹھی تو۔ یہ دیکھ کر پدما کی حالت ویسی ہی ہو جاتی ہے جیسے بجلی کڑکتے ہی گھوڑی خوفزدہ ہو کر بھاگنے کی کوشش کر رہی ہو۔ وہ اپنے بال نوچتی رہتی ہے۔ دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر لہولہان ہو جاتی ہے۔ پھر غش کھا کر یوں خاموش ہو جاتی ہے گویا آتش فشاں پہاڑ پھٹ کر شانت ہو چکا ہو۔ ہوش آتا ہے تب وہ گھنٹوں چھت کو گھور گھور کر دیکھتی رہتی ہے۔ سسکتی رہتی ہے۔ نہ کوئی سوال کرتی ہے اور نہ کسی سوال کا جواب دیتی ہے۔

اس کی یہ قابلِ ترس حالت دیکھ کر چند سپاہیوں اور تماشائیوں کا دل بھر جاتا ہے۔ مگر بیشتر لوگوں بلکہ تحقیق کرنے والے پولیس افسر بھی پدما کی خاموشی کو معنی خیز بتا کر یہی سوچ رہے ہیں کہ یہ سب بناوٹ ہے اور ایک انوکھی داستان پر پردہ ڈالنے کی کوشش ہے۔

ظاہر ہے لوگ نت نئی باتیں سنا کر داستان کو اپنے اپنے طریقے سے بیان کرتے ہیں۔ کیوں نا کریں آخر پدما گھر گھر میں بحث کا موضوع بن چکی ہے۔ لوگ یہ محسوس کر رہے ہیں کہ اس قیامت خیز خوبصورت عورت پر کسی آسیب کا سایہ ہے۔ کوئی سمجھ رہا ہے کہ وہ پاگل ہو چکی ہے۔ کوئی کہتا پھرتا ہے بھئی پاگل کتے نے کاٹ کھایا ہوگا ہائیڈرو فوبیا ہو گیا ہے۔ مگر اخبار والے پاگلپن یا دیوانگی کو سنگین جرم کے زاویوں سے دیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں اور اپنے کالموں میں بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ مثلاً یہ کہ شاید کروڑپتی کی بیوی کسی اچھے وکیل کے مشورے پر سزا سے بچنے کی خاطر پاگلپن کا ڈھونگ کر رہی ہے۔ مگر صداقت

یہ ہے کہ واردات کے تیسرے دن بھی نہ تو پدما کی ضمانت منظور ہوئی ہے اور نہ اس کو پاگل خانے بھیجا گیا ہے۔ بات عورت کی ہو تو لوگ اور بھی جانے کیا کیا کہتے رہتے ہیں۔ کچھ اخلاق سے گری ہوئی باتیں جس کو سن کر نفرت اور جذبات دہکتے انگارے بن کر پدما کو راکھ کر دینا چاہتے ہیں۔

کچھ لوگ اس شیطانی عورت کے خلاف تھانے کے باہر مظاہرے بھی کرتے رہتے ہیں اور یہ بھی مانگ کرتے ہیں کہ عورت کے نام پر کلنک لگانے والی اس عورت کو سرِ عام پھانسی دی جائے۔ پولیس مظاہرے کرنے والے لوگوں اور پدما کے درمیان نہ آئے تو وہ پدما کے اخبار میں چھپے فوٹو گراف کو پاؤں سے مسلنے کی بجائے پدما کو ہی سنگسار کر دیں پولیس بھی آخر کیا کرے۔ آخر ایک ماں جس نے نہایت بے رحمی سے اپنے ۱۸ سالہ اکلوتے بیٹے کو قتل کر دیا ہو۔ اس کے بارے میں رائے عامہ اور کیا ہو سکتی ہے؟ پدما کو پولیس نے رنگے ہاتھوں گرفتار کر لیا ہے۔ اس لیے شک کی بھی گنجائش نہیں۔ ہاں کچھ لوگ یہ محسوس کر رہے ہیں کہ ماں نے شاید کسی تانترک کے وش میں آکر بیٹے کو قتل کر دیا ہو۔ مگر یہ ثابت ہو چکا ہے کہ قتل سے پہلے یا قتل کے بعد کبھی کوئی تانترک یا اس قسم کا کوئی مشکوک شخص مکان میں داخل نہیں ہوا۔

پھر ماں کیسے ڈائن بن کر بیٹے کو کھا گئی۔ وہ اکلوتا بیٹا جو پورے ایک سال بعد چھٹیاں کاٹنے آیا تھا۔؟

پدما بھوشن جنگلات کے ٹھیکیدار برج بھوشن کی چوتھی بیوی ہے۔ بیچارے ٹھیکیدار کی قسمت ہی ایسی ہے۔ پہلی تین بیویاں شادی کے ایک دو سال کے اندر ہی فوت ہو گئی تھیں اور چوتھی نے اس کو جیتے جی مار دیا۔ برج بھوشن نے جب پدما سے تقریباً ۱۵ سال پہلے شادی کی تھی تب وہ خود ۴۰ سال کا تھا جب کہ پدما مشکل سے ۱۷ سال کی تھی۔

گاؤں سے جب وہ شہر آیا تو کسی نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ وہ دیکھتے ہی دیکھتے کروڑ پتی کیسے بن گیا۔ مگر اب اخبار والے میاں بیوی کے ماضی کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کی کوشش کر رہے ہیں اور اپنے زیادہ سے زیادہ کالم بھر رہے ہیں۔ آخر وہ بھی کیوں نہ لکھیں اس انوکھے قتل کے بارے میں جانکاری حاصل کرنے والے اخبار مہنگے داموں پر بھی خرید رہے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ سارا شہر جان چکا ہے کہ برج بھوشن کا گھر کسی مہاراج کے قلعے سے کم نہیں ہے۔ بڑی ڈیوڑھی تب کھلتی ہے جب برج بھوشن کی کار احاطے میں داخل ہو جاتی ہے اور چھوٹی ڈیوڑھی تب کھلتی ہے جب ان کا خاص نوکر سومو کسی کو اندر آنے کی اجازت دے ورنہ ہرگز نہیں اور جو بھی اندر آتا ہے سومو ایک سیکورٹی گارڈ کی طرح اس کے ساتھ ساتھ رہتا ہے۔ اس کی حرکتوں پر نظر رکھتا ہے کام ہوا تو ڈیوڑھی بند۔

تقریباً ۲۵ کمروں والے ایک عالیشان مکان میں برج بھوشن، پدما، سومو اور ایک نوکرانی کے علاوہ مقتول اجے بھوشن رہتا تھا۔ اجے جنوبی ہند کے کسی دور دراز کالج میں ڈاکٹری پڑھنے گیا تھا اور اسی روز گھر آیا تھا۔ جب اس کو گلا گھونٹ کر قتل کر دیا گیا۔

چونکہ یہ سب محلے والوں سے کٹے ہوئے تھے اس لیے ان کو واردات کے بارے میں علم بھی نہ ہوتا اگر اچانک پولیس کی جیپیں اور ایمبولنس کی گاڑی احاطے کے اندر داخل نہ ہو پاتیں۔ ورنہ اس گھر میں داخل ہونے والا جب دروازے پر دستک دیتا تھا تب یوں لگتا تھا جیسے کوئی فریادی شہنشاہ کے دربار میں حاضر ہونے کی اجازت چاہتا ہو۔

اس گھر میں یہ سب پابندیاں کس نے عائد کی تھیں۔ شوہر نے یا بیوی نے یہ وہ بھی نہیں جانتے جن کی دیواریں ان کی دیواروں سے جڑی ہوئی ہیں پھر یہ کوئی کیسے جان سکتا تھا کہ پدما دن بھر مکان کے اندر بیٹھی کیا کرتی ہے۔ فلموں سے متاثر چند دل پھینک نوجوان یہاں تک سوچتے ہیں کہ کہیں اندر باہر جانے کا کوئی چور دروازہ تو نہیں ہے یا کوئی زمین دوز ٹنل وغیرہ لیکن پدما کی خاص نوکرانی گیتا یہ بتا چکی تھی کہ پدما اپنا زیادہ سے زیادہ وقت اپنے کمرے میں گزارتی تھی۔ کبھی چھت کو گھورتی رہتی تھی اور کبھی بالکونی میں بیٹھ کر نیلے آکاش اور دور دور کھڑے برفیلے پہاڑوں کو دیکھا کرتی تھی۔ مگر جب بادل گرجتے تھے تب اس پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو جاتی تھی اور کہیں چھپ جانے کی کوشش کرتی تھی۔ لگتا تھا کوئی اس کے قریب آ رہا ہے اور وہ اس کو بار بار دھکا دے کر اپنے سے دور رکھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ پھر وہ پردے کو سینے سے لگا کر چیخ پڑتی تھی۔ پھر یوں اچھل اچھل کر دوڑتی تھی گویا نوکیلے کانٹوں پر چل رہی ہو، پھر لگتا تھا جیسے

اُسے اس نے کسی کو دبوچ کر اُس کا گلا دبا دیا ہو۔ مگر پھر جب وہ گھر جاتی تھی تو تو لگتا تھا جیسے میڈم نہیں بلکہ کوئی اور چیخ و پکار کر رہی تھی چلا رہی تھی۔ اور رو رہی تھی اور اپنے کپڑے پھاڑ رہی تھی۔

گیتا یہ بتا چکی تھی کہ ایسا ہی پچھلے پندرہ سال سے ہوتا رہا ہے۔ مگر اس بارے میں برج بھوشن اور سومو کی خاموشی یا بوکھلاہٹ ان دونوں کو مشکوک کردار بنا رہے تھے۔ جب سومو پر دباؤ پر دباؤ پڑا تو اس نے بتایا کہ پدما کی ایسی ہی حالت تھی جب وہ ناری نکیتن میں رہتی تھی اور اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی سامنے آئی کہ پدما کا ماضی داغدار ہے۔ ایک ایسی لڑکی جس کو چال چلن میں سدھار کے لیے پولیس نے ناری نکیتن کے سپرد کیا تھا اور یہ کہ برج بھوشن صرف خوبصورتی سے متاثر ہو کر پدما کو بیاہ کر لایا تھا۔

سومو یہ سب اس لیے جانتا تھا کیونکہ وہ برج بھوشن کے ساتھ پچھلے ۲۰ سال سے کام کرتا آیا ہے اور وہ اپنے مالک کے اشارے پر مر مٹنے والا سورما ہے اخباروں میں جب یہ کہانی آگئی، تب سے گلی گلی کوچے میں چائے کی دوکانوں، نائی کی دوکانوں، سبزی منڈیوں، دفتروں اور بسوں میں صرف پدما بھوشن کے چرچے ہو رہے ہیں۔ قیاس آرائیاں جہاں دلچسپی کا مواد پیدا کرتی ہیں وہاں اس انوکھے قتل کے معمے کو حل کرنے کے لیے پیچیدگیاں بھی پیدا کرتی رہیں۔ حالات اور بیانات کبھی برج بھوشن کو مجرم ثابت کرنے کی راہ ہموار کرتے رہے وہاں سومو کو بھی پدما کے ساتھ جوڑ کر کہانیاں بناتے رہے عام لوگ یہ سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ آخر برج بھوشن نے اپنی جوان بیوی کو سونے کے پنجرے میں کیوں قید کر دیا ہے۔ کیا اس لیے کہ وہ اس سے اندر ہی اندر دھندہ کرواتا تھا یا ایک غیرت مند شوہر کی طرح اس پر کڑی نگاہ رکھتا تھا۔ کیا دونوں میں اختلاف تھا یا کوئی اور بات جس کی وجہ سے بیٹا شکار ہوا۔ اور وہ بھی اس لیے کہ ماں بیٹے کو پل بھر کے لیے بھی اپنے سے دور نہیں رکھنا چاہتی تھی۔

ایک بیٹا ہی تو تھا جس کے ساتھ پدما ہنس ہنس کر باتیں کیا کرتی تھی۔ اکثر اپنے ماں کے کمرے میں ہی سویا کرتا تھا۔

مقتول ایک اچھا شرمیلا لڑکا تھا یہ بھی کہہ چکے تھے مگر گیتا کی رائے اچھی بھی تھی اور بُری بھی۔

حالانکہ وہ کچھ کہنے سے جھجک رہی تھی مگر دباؤ میں یہ بتا چکی تھی کہ مقتول ٹریننگ پر جانے سے پہلے اکثر چوری چھپے اس کو گھورتا رہتا تھا تاکہ میرے بدن کے کسی حصے کو کسی نہ کسی بہانے سے چھو سکے۔ مگر وہ داڑھی مونچھ کے بغیر ۱۶ سال کے لڑکے سے خوفزدہ ہونے کی بجائے پریشان ہوا کرتی تھی کہ یہ لڑکا گھر سے باہر رہ کر کسی چکر میں نہ پڑ جائے۔ مگر گیتا یہ بھی بتا چکی تھی کہ مقتول اپنی ماں سے بہت ڈرتا تھا۔ جب کہ ماں بیٹے کو ہر وقت سینے سے لگانے کے لیے بے چین رہتی تھی۔

اور جب گیتا نے اس بات کا انکشاف کیا کہ مقتول اجے بھوشن پدما کا اپنا بیٹا نہیں بلکہ کسی اناتھ آشرم سے گود لیا بچہ ہے تو سارے شہر میں تہلکہ مچ گیا۔ کیا کچھ ہو سکتا ہے لوگ بہت کچھ سمجھ کر بھی اپنی زبان پر کچھ نہ لا سکے۔ مگر اخباروں نے مجبوراً وہ بات لکھ دی جس کو زبان پر لانے سے پہلے ہر شخص اپنے منہ میں خاک ڈال دینے کی بات کرتا رہا۔ ماں بیٹے کے رشتے کو رسوا کیا گیا تو عام لوگوں کے چہروں پر لالی یہ مانگ کر رہی تھی کہ ایسی ڈائن کو زندہ جلا ڈالو۔ شاید بیٹے کے ہی اندر شیطان چھپا بیٹھا تھا۔ باہر آیا تو ماں نے کچل ڈالا۔ لوگ یہ بھی سوچتے رہے۔ مگر پولیس صرف یہ سوچ رہی تھی کہ اگر پدما اور سومو کے ناجائز تعلقات تھے تب ہو سکتا ہے کہ بیٹے نے درمیان میں کھڑے ہو کر جان گنوا دی۔ لیکن اگر مقتول اور قاتل کے درمیان کچھ سلسلہ تھا تب ہو سکتا ہے۔ برج بھوشن نے قتل کیا ہو یا سومو سے کروایا ہو۔ مگر پدما اپنا اقبال جرم کر چکی تھی اور وہ یہ بڑبڑاتی ہے۔ یا چیخ کر کہتی ہے۔ ہاں۔ ہاں میں نے اجے کو مار ڈالا۔ میں نے اجے کو مار ڈالا۔ کیوں مار ڈالا۔ اس کا جواب دینے کے بجائے پدما بوکھلا جاتی ہے۔ یا پھر وہی چیخنا چلانا اپنے ناخنوں سے جسم کو کھرچنا۔ بال نوچنا اور پھر دھڑام سے یوں گر جانا گویا مر گئی ہو۔

شاید اس لیے پولیس تذبذب میں ہے کہ کیا کیا جائے۔ کیونکہ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ مصلحتاً کسی کا جرم اپنے سر لے رہی ہو۔ مگر کون ہے وہ؟

قتل کے چوتھے دن تمام اخبارات کے سنڈے شماروں میں جب کیس کی پوری تفصیل آ گئی تو برج بھوشن پر بجلیاں گر گئیں وہ بہت سے وکیلوں سے مایوس لوٹ کر جب پدما سے ملنے تھانے پر آیا تو آس پاس کے لوگوں کے تاثرات پڑھ کر وہ ٹوٹ گیا اور ایک کاٹھ کے ٹکڑے کی

طرح فرش پر گر گیا۔ شاید اس کے لیے اخبار میں یہ لکھا تھا قتل اس نے کیا ہے۔ کیونکہ اس نے مقتول کو ننگے ہاتھوں پکڑ لیا تھا۔ دور سلاخوں سے جھانکتی ہوئی پدما نے جب یہ منظر دیکھا تو وہ اتنی زور سے چیخ پڑی کہ آس پاس کھڑے لوگ چونکنے کے ساتھ ڈر بھی گئے۔

جب تحقیق کرنے والا پولیس انسپکٹر پدما کے قریب گیا تو پہلی بار اسے اس کو نہ روتے دیکھا نہ چیختے چلاتے دیکھا اور نہ یہ بتاتے کہ میں نے اجے کو مار ڈالا ہے اچانک وہ ایک نارمل عورت نظر آئی مگر تھکی تھکی، بجھی بجھی سی انسپکٹر مسکراتا رہا کیونکہ اس کو شروع سے ہی یہ شک تھا کہ پدما پاگلپن کا ڈھونگ رچا رہی ہے۔ شاید اسی لیے کہ قتل کے دن نہ تو بادل گرجے تھے نہ بجلیاں چمکی تھیں اور نہ تیز بارش ہوتی تھی۔

پدما رنج و غم میں ڈوبی ہے مگر اس کی سنجیدگی اور باوقار طرز بیان کو دیکھ کر انسپکٹر کو یقین نہیں آرہا ہے کہ وہ ایک قاتلہ سے بات کر رہا ہے۔

پدما کا بیان قلمبند کرنے کے بعد جب پدما نے اپنے شوہر کو ہسپتال میں دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا تب انسپکٹر خود ساتھ لے جانے کے لیے تیار ہوا۔

برج بھوشن کو نیم بے ہوش کی حالت میں دیکھ کر پدما بہت روئی اور برج بھوشن کے پاؤں اپنی چھاتی سے رکھ کر تب تک سسکتی رہی جب تک ڈاکٹر نے کمرے سے جانے کے لیے نہیں کہا۔ برج بھوشن کو جب بھی ہوش آجاتا وہ پدما کو معنی خیز نظروں سے دیکھ کر آہیں بھرتا اور پھر بے ہوشی کے سمندر میں ڈبکیاں لگاتا۔ شاید اس لیے کہ وہ پدما کی تڑپ محسوس کر سکتا تھا۔ مگر اس دوران نہ پدما کچھ بول سکی اور نہ برج بھوشن۔

انسپکٹر یہ منظر دیکھ کر پدما کے بارے میں سوچتا رہا اور گئی رات تک پدما کے بارے میں ہی سوچتا رہا۔ بار بار اس کے بیان کو پڑھتا رہا اور ہر بار دل میں کسک سی محسوس کرتا رہا۔

آج پھر پدما کو دیکھنے والے لوگ آئے ہیں اور وہ پھر چیخ رہی ہے۔ چلا رہی ہے روتے اپنے بدن کو ناخنوں سے کھرچ رہی ہے۔ مگر انسپکٹر پدما کی بڑی بڑی خوبصورت مگر مرجھائی ہرنی کی آنکھوں میں اس کی زندگی کی کہانی ایک بار پھر جاننا چاہتا ہے۔ حالانکہ بیان پدما سب کچھ بتا چکی

ہے۔ دور بہت دور پہاڑیوں کی گود میں پدما گاؤں میں ندی کے کنارے ایک سرکاری افسر کا پکا کوارٹر اور ساتھ ہی چوکیدار کا چھوٹا سا گھر بوڑھا باپ سرکاری افسر کا کھانا بنایا کرتا تھا اور ۱۵ سال کی بیٹی اس کا ہاتھ بٹایا کرتی تھی افسر بہت مہربان تھا اور پدما کو بیٹی کی طرح پیار کرتا تھا۔ پھر افسر کے گھر والے چھٹیاں گزارنے آئے۔ سا تھ میں ایک ۱۸ سال کا بیٹا اور دو چھوٹی بیٹیاں۔ بیٹا کسی کالج میں پڑھتا تھا اور پدما کو بات بات پر ہنسایا کرتا تھا۔ اپنی بہنوں کی طرح اُسے بھی کبھی تاش کی کوئی گیم سکھاتا اور کبھی جنگل لے جا کر خوب سیر کرواتا تھا۔ مگر جس روز وہ واپس لوٹ کے جا رہے تھے۔ اس سے ایک دن پہلے بادل گرجتے رہے۔ بجلیاں چمکتی رہیں اور اس وقت زبردست بارش ہوتی رہی تھی جب منہ بولے بھائی نے پدما کو دبوچ کر کچل ڈالا۔ وہ چیختی رہی چلاتی رہی مگر اس کی آواز کو بادلوں کی گرج نے دبوچ ڈالا۔ باپ نے بیٹی کا چہرہ پڑھ لیا اور دم توڑ دیا۔ مگر باپ جیسا افسر یہ سمجھتا رہا کہ بیٹی باپ کی موت کا صدمہ برداشت کرنے کی کوشش نہیں کر رہی ہے۔

پھر جب احساس ہوا کہ وہ ماں بننے والی ہے تب وہ دریا میں کود پڑی مگر اپنے باپ کی گود میں پہنچنے کی بجائے وہ پولیس تھانے میں پہنچ گئی۔ اور پھر ناری نکیتن۔ چال چلن میں سدھار کی خاطر۔

انسپکٹر پدما کو دیکھتا رہا اور اپنے ساتھی سے باتیں کرتا رہا۔

دراصل کہانی کا یہ حصہ اخبار میں آچکا تھا۔ مگر انسپکٹر اپنے ساتھی کو کہانی کا دوسرا حصہ سنا رہا ہے جبکہ پدما معمول کے مطابق چیخنے چلانے کے بعد دھڑام سے فرش پر گر گئی ہے۔ شاید بے ہوش ہو چکی ہے اسی لیے سپاہی پانی پلانے کی کوشش کر رہا ہے۔

پدما کو آج رات عدالت میں جانا ہوگا اور اس کا چالان پیش ہوگا۔

انسپکٹر اپنی تیاری مکمل کر چکا ہے اور اپنے ساتھی سے کہہ رہا ہے۔ واردات کے دن پدما بہت خوش تھی۔ وہ اپنے بیٹے کا سواگت کرنا چاہتی تھی اور وہ بھی چار سو بکھری ہوئی خوشبو سے منوں پھول اکٹھے تھے اور اس نے سوم اور گیتا کو اور پھول لانے کے لیے بھیجا تھا۔

برج بھوشن بیٹے کو لینے ریلوے اسٹیشن پر گیا تھا مگر اجے بھوشن سیدھے اپنے گھر آ کر ماں کو سرپرائز دینا چاہتا تھا اور وہ چپ چاپ کسی کو بتائے بغیر ماں کے بیڈ روم میں چلا گیا تھا۔ ماں

باتھ روم میں تھی۔ دروازے پر دستک ہوئی تو وہ سمجھی اس کی نوکرانی گیتا ہوگی۔ مگر وہاں کوئی اور تھا۔ پدما چیخ پڑی۔ ایک جانا پہچانا چہرہ جس کو یاد کرتے کرتے وہ اکثر اندر ہی اندر ابل پڑتی تھی۔ سامنے تھا وہی بھورے بھورے لمبے بال۔ چہرے پر بھوری داڑھی اور آنکھوں پر ایک عینک۔ پدما دیکھتے ہی ایک زخمی شیرنی کی طرح اس پر ٹوٹ پڑی۔ اور اس کی گرفت تب ڈھیلی پڑی جب شکار کا سانس رک چکا تھا۔

مگر اگلے ہی لمحے پدما کو احساس ہوا کہ مردہ انسان وہ نہیں ہے جس نے ۱۹ سال پہلے اس کی عزت لوٹ لی تھی بلکہ اس کا بیٹا اجے بھوشن ہے جو داڑھی مونچھ اور عینک پہن کر بالکل باپ جیسا لگ رہا تھا۔

دراصل جس لڑکے کو پدما اناتھ آشرم سے لے آئی تھی وہ اس کا اپنا بیٹا تھا یہ برج بھوشن بھی جانتا تھا اور سومو بھی۔

انسپکٹر مایوس ہے اور پدما کو دیکھ کر کہہ رہا ہے۔
کون سوچ سکتا تھا کہ اس بدنصیب عورت کی اتنی دردناک کہانی ہوگی۔ پھر بھی قتل قتل ہے جرم کی سزا تو ہوگی۔

پھانسی یا عمر قید۔
یہ سن کر پدما آخری بار چیخ پڑی اور پھر جھولی پھیلا کر کہنے لگی۔ مجھے موت چاہیے زندگی نہیں۔
اور تھانے کے باہر لوگ کھڑے چپ چاپ پدما کے چہرے کو دیکھتے رہے۔
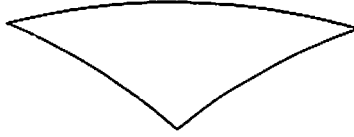
میں نے جب دھرو[1] بھگت کی طرح کڑی تپسیا کی تو بھگوان نے خوش ہو کر مجھ سے پوچھا بول سچے بھگت۔ تمہیں کیا چاہیے؟ کیا تمہیں بھی دھرو کی طرح تارا بنا دوں؟ میں نے کہا نہیں پربھو۔ مجھے انسان ہی بنا دیں۔ ایک ایسا انسان جو کسی کو دکھ نہ دے۔ بھگوان نے خوش ہو کر ہاں کر دی اور تب سے اب تک میں اپنے ہر جنم میں انسان ہی ہوتا ہوں۔ میرا یہ دعویٰ ہے کہ میں نے اپنے کسی بھی جنم میں کسی کو دکھ نہیں دیا ہے۔ دراصل میں ایسا کر ہی نہیں سکتا۔ مگر جانے کیوں مجھے صدیوں سے لوگ صرف دکھ دیتے رہے۔ دکھ کے سوا کچھ بھی نہیں۔ میں کبھی کوئی جرم یا گناہ نہیں کرتا ہوں ہاں شاید ایک قصور ہے میرا۔ میں سچی بات کرتا ہوں۔ سمجھانے پر بھی کبھی مصلحت سے کام نہیں لیتا ہوں۔ منہ پھٹ ہوں۔ مجھے کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے کہ اگر میں ایسا نہ ہوتا تو پھر کیسا ہوتا۔ ظاہر ہے جس شکل میں نظر آتا ہوں اتہاس بھی مایوس ہی کرتی ہے۔ کاش میں یہ نہ کہتا کہ بھگوان رام نے دھوکے سے سگریو[2] کے بھائی بالی کو مار ڈالا۔ یہ سب چلا چلا کر بولنے کی کیا ضرورت تھی کہ بھگوان کرشن نے کرن[3] کو چالاکی سے ختم کر دیا۔ یا پھر بھگوان بدھ نے سنیاس لے کر اپنے بیٹے اور بیوی کے ساتھ ظلم کیا۔ ارے بھگوان جب انسان کے روپ میں دھرتی پر اتر جاتے ہیں تو ہر غلطی معاف ـــ ہے کہ نہیں ـــ مگر میں ہی بیوقوف سمجھ پاؤں تب نا۔ بس ست یگ سے کل یگ تک یہی غلطیاں کرتا آ رہا ہوں۔ چاہے راجوں مہاراجوں کا یگ تھا یا انگریزوں کا زمانہ۔ زمانہ شجاعت تھا یا آج کل کا لوک راج عوامی راج۔ میں بس کچھ نہ کچھ بولتا ہی رہتا ہوں۔ حالانکہ ایک دانشور نے مشورہ دیا کہ بچے کیوں مرنے سے پہلے ہی جیتے جی مر جاتے ہیں۔ کیوں نہیں تیل

---

[1] ہندؤں کا ایک دیوتا　　[2] رامائن کا ایک کردار

[3] مہابھارت کا ایک کردار۔ پانڈؤں کا بھائی جس نے کوروؤں کا ساتھ دیا تھا۔

دیکھتے تیل کی دھار دیکھ لیتے۔ پہلے تولتے اور پھر بولتے! آخر میں اسی مہارشی کے شرن میں آگیا اور ان کے ہی آشیرواد سے منوجی سے میری ملاقات ہوئی۔ منوجی کو آپ جانتے ہونگے نا؟ ہاں وہی جنہوں نے ذات پات کا رواج شروع کیا تھا۔ سماج کو چار حصّوں میں بانٹ دیا تھا۔ جانے کیا سوچ کر انہوں نے کسی کو برہمن، کسی کو کھتری، کسی کو ویش اور کسی کو ہریجن بنا دیا تھا؟

منوجی کی میں نے خوب سیوا کی تھی اس لیے ایک دن جب وہ ایک اچھے موڈ میں تھے اور تازہ خیالات کو اپنانے کی مشق کر رہے تھے تو میں نے پوچھا مہاراج یہ سب کیا ہے۔ انسان کو انسان سے کیوں جدا کیا ہے آپ نے؟ اگر کام کاج کا بٹوارہ ہی کرنا تھا تو کرم سے کر لیتے۔ جنم سے کیوں؟ اور وہ بھی دھرم سے کیوں؟ جنم دینا تو بھگوان کے ہاتھ میں ہے پھر جنم لینے والے پر ستم کیوں؟ ستم اس لیے کہہ رہا ہوں کیونکہ مجھ پر بیتی ہے نا۔ اس لیے۔

منوجی بولے۔ بچے۔ کوئی تمہیں بہکا رہا ہے ورنہ تم ایک دانشور ہو، تم پر سرسوتی ماں کی کرپا ہے۔ اس لیے اپنی بات کرنی ہے تو صرف اپنی فکر کرو نا۔ ادھر ادھر کی باتیں نہ کرو کیونکہ دوسروں کے بارے میں سوچ سوچ کر اپنا لہو جلا رہے ہو۔ بھئی اگر تمہیں ذات پات میں خامیاں نظر آ رہی ہیں تو ٹھیک ہے ہم تم سے پوچھ لیا کریں گے کہ بولو تم مرنے کے بعد اگلے جنم میں کس جگہ بلکہ کس ذات۔ یہاں تک کہ کس کے گھر میں پیدا ہونا چاہتے ہو۔ اور پھر وہی ہوگا جو تم چاہتے ہو۔ بس فوراً بولا۔ مہاراج ان جنگلوں میں رہ کر تنگ آ چکا ہوں اور یہ بندر مجھے بہت تنگ کر رہے ہیں۔ میں یہ شریر ابھی اور اسی وقت چھوڑ کر کسی پڑھے لکھے ہریجن کے گھر پیدا ہونا چاہتا ہوں۔ چاہے وہ ہریجن مدراس میں رہتا ہو یا کشمیر میں۔ گجرات میں رہتا ہو یا ہردوار میں۔ میں علم کی روشنی سے جہالت کے اندھیرے کو مٹا دوں گا۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا اور دوسرے دن ایک غریب پجاری کے گھر پیدا ہوا۔ ہریجن کے گھر پیدا ہوا اس لیے ہریجن ہی کہلایا اور وہ بھی بچپن سے ہی حالانکہ سنسکرت تو کیا میں کوئی دوسری زبان بھی نہیں بول سکتا تھا۔ بڑا ہو گیا تو اسکول میں لوگ مجھے ہریجن دیوتا کہتے رہے۔ مگر انہیں دلوں میں نے دیکھا کہ کچھ لوگ مجھے نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ میں نے کبھی کوئی برا کام نہیں کیا تھا۔ ہاں، ریتی رواج کے تحت اگر باپ نے مجھے جنیؤ پہنا دیا تو

کیا کرتا ۔ میں اگر کسی یہودی کے گھر پیدا ہوا ہوتا تو شاید سر پر چوٹی رکھتا اور نہ جنیئو پہنتا ۔ باپ ودھوان
تھا اس لیے شاستر پڑھ لیے ۔ یہ بھی کوئی غلط کام نہیں کیا تھا ۔ ہاں یہ بات صحیح ہے کہ میں صرف
سرسوتی کی مدد سے دوسروں کے مَن کا اندھیرا مٹا سکتا تھا ۔ اپنے ہاتھوں سے نالی صاف نہیں
کر سکتا تھا ۔ پھر جانے کیوں مجھے سزا ملتی رہی ۔ میرے خلاف جلسے جلوس کیوں ؟ میں نے کب کہا کہ
سبھی انسان ایک جیسے نہیں ۔ گاندھی جی کے آشرم میں زندگی کا خاصا وقت گزرا ہے ۔ سب کو ایک
ہی نظر سے دیکھا ہے ۔ سب کو سُکھ دیا ہے ذات پات کے بندھنوں کو توڑ کر سب کو گلے سے لگایا ہے ۔
پھر مجھ پر یہ عذاب یہ سزا کیوں ؟ مانا کہ میں نے خود اپنی مرضی سے ایک ہریجن کے گھر پیدا ہونا
پسند کیا تھا مگر میرے بھائیوں نے تو ایسا نہیں کیا ہے ۔ پھر میرے گھر پیدا ہونے والے میرے بچے کو
جنم کی وجہ سے سزا کیوں ؟ اس کے کرم بہت اچھے ہیں ۔ ہونہار ہے، عقلمند ہے، خوب دل لگا کر
پڑھائی کیا کرتا ہے ۔ اچھے نمبر لاتا ہے ۔ پھر اچھے کرموں کا اس کو اچھا پھل ملنا چاہیے تھا ۔ لیکن ملا نہیں ۔
جب ذات پات کے بندھن مٹا دیے گئے ہیں پھر سب کو ایک ہی قطار میں کیوں نہیں کھڑا کیا جاتا
ہے ۔ کیوں میرے بیٹے کو بار بار قطار سے باہر نکال کر دوسری قطار میں کھڑے رہنے کو کہا جاتا ہے ۔
یہی حال میرے پڑوس کا ہے ۔ ویش ہے دوکانداری کرتا ہے ۔ مگر ساری دوکان میں اتنی مالیت کا
سامان ہے کہ بیچا جائے تو دس دن روٹی کھا سکتا ہے ۔ مہینہ نہیں ۔ اس لیے اس کا بیٹا دوکانداری
نہیں کرنا چاہتا ہے ۔ وہ بھی بہت لائق ہے ۔ سائنسی کرشمات کرنا چاہتا ہے یا پھر آئی ۔ اے ۔ ایس
آفیسر بن جانا چاہتا ہے مگر کیسے ؟ ۔ تو کیا ہمارا جنم ہی ہمارے راستے کا سب سے بڑا کانٹا ہے ۔
وہ لوگ کون ہیں جن کو ہاتھ پکڑ پکڑ کر راستے پر چلایا جا رہا ہے منزل کے ہر نشان پر وہ گرنے لگتے ہیں
تو وہاں ان کو گود میں اٹھا لیا جاتا ہے بہت سارے لوگ اس لیے خود چلنے پھرنے کی کوشش
نہیں کرتے دوڑنا تو در کنار ۔ معلوم ہے ان کو کہ گود میں اٹھا لیے جائیں گے ۔ اس لیے کیوں محنت
کریں ۔ مگر یہ لوگ ہیں کون ؟ ۔ اچھا اچھا یہ سب پسماندہ ہریجن لوگ ہیں ۔

چلو نیتی ہی ایسی ہے تو ہم کیا کریں ۔ میرے بیٹے کے پیر کاٹ دیے گئے ہیں لیکن میں کیا کر سکتا
ہوں ملو نچھ رہا ہے ۔ پتا جی اگر آپ بھی ہریجن ہوتے تو میں بھی ڈاکٹر صاحب کا کھانا بنانے کی بجائے

؎ مہاتما گاندھی

خود ڈاکٹر بن گیا ہوتا۔ یہی بات سن سن کر میں نے سوچا کہ ایک قابلِ رحم اور اپاہج باپ کی زندگی بسر کرنے سے اچھا ہے کہ میں خودکشی کرلوں۔ مر جاؤں تو منوجی کے آشیرواد سے اپنی پسند کا جنم لوں۔ بیشک ایسا ہی ہوا۔ میری مراد پوری ہوگئی۔ میں نے کسی پسماندہ ہریجن کے گھر پیدا ہونے کی مانگ کی تھی سو وہ پوری ہوگئی۔ میرے نئے جنم میں میرا باپ سڑکیں صاف کرنے والا بالمیکی ہے۔ جس روز میں پیدا ہوا اسی روز میرا باپ کسی لیڈر کا بھاشن سن رہا تھا۔ یا ووٹ دے کر آیا تھا۔ میری ماں سے کہنے لگا میں اپنے بیٹے کو بہت بڑا افسر بناؤں گا۔ اپنے ظالم سینٹری انسپکٹر سے بھی بڑا۔ نام دیا کرشن۔ یہ نام مجھے میرے باپ نے اپنے پچھلے جنم میں بھی دیا تھا۔ مگر نام میں کیا رکھا ہے۔ ترقی کا راز تو ذات میں پوشیدہ ہے۔ میں مطمئن تھا کہ سب کچھ صحیح جا رہا ہے۔ یعنی گھر میں کھانا نہیں۔ پہننے کو کپڑا نہیں، رہنے کو اچھا گھر نہیں۔ مگر سرسوتی گھر میں آئی تھی۔ میری ماں بھی میرے قاعدے سے بڑے شوق سے دیکھا کرتی تھی اپنا پیٹ کاٹ کر مجھے پڑھایا یہ سوچ کر کہ ایک بالمیکی کا بیٹا انجینئر بن جائے گا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ حالانکہ جو انجینئر بن گیا اس کا باپ بھی بالمیکی تھا مگر ذات سے کرم سے نہیں۔ اس کا باپ بلکہ اس کا دادا بھی انجینئر تھا۔ جب مجھے اس جنم میں بھی قطار میں رہ کر منزل کے قریب پہنچ کر قطار سے نکالا گیا تو میں چلانے لگا۔ میں بھی ہریجن ہوں اس لڑکے سے زیادہ قابل۔ یہ دیکھ لو میرے دستاویز! میں بہت غریب ہوں اور جن لڑکوں کو آپ نے منتخب کیا ہے۔ ان میں سے ایک کے باپ کے پاس جوتے بنانے کی بہت بڑی فیکٹری ہے اور وہ کار میں بیٹھ کر اسکول آیا کرتا تھا۔ جب کہ میں ننگے پاؤں۔ اس کا بھائی ہمارا نمائندہ ہے اس لیے وزیر بن گیا ہے اور اس نے اپنے بھائی کے بنجر ذہن کی آبیاری کے لیے روپیہ پانی کی طرح بہا دیا ہے۔ جب کہ میرے پاس ٹیوشن فیس تو درکنار۔ اسکول کی فیس بھی بڑی مشکل سے پیدا کی جاتی تھی۔ یہ سیٹ میرا حق ہے میں ہی مستحق طالبِ علم ہوں۔ میری شکل دیکھ لیجیے۔ میں ہی پسماندہ ہریجن۔ آپ خاموش ہیں اور مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ سمجھوتہ کروں۔ یہ سوچ کر دیش کو آگے بڑھانا ہے۔

نادان تھا اس لیے سچی بات کہہ دی۔ خاموش رہتا تو شاید کلرک تو بنا دیا جاتا۔ بول پڑا نا اس لیے میرا باپ سڑکیں صاف کرتا رہا اور میں ڈاکٹر صاحب کا میز صاف کرتا رہا۔ ذی ہوش تھا۔ حساس تھا۔ جذباتی تھا۔ اس لیے دق کا شکار ہوا۔ اچھا کیا جو شادی نہیں کی ورنہ سارے خاندان کو پیدائشی

روگ لگ جاتا ہے نا؟

حالانکہ انسان پر انسان کا اتیاچار، ظلم تشدد دیکھ کر اور ذات پات کی آڑ میں خود غرض اور مطلب پرست لوگوں کا ستم دیکھ کر پھر سے جنم لینے کو جی نہیں چاہ رہا تھا مگر دوسرا جنم تو لینا ہی تھا۔ دھروتارا تو بن نہیں سکتا تھا۔ اس لیے جب سرکاری ہسپتال کے ایک گندے سے وارڈ میں آخری سانس لے رہا تھا تو ایک ساتھی نے ایک ایسی حسرت کی عکاسی کی کہ پھر سے جنم لے کر اس کارواں میں شامل ہونے کو جی چاہا جو یکسانیت کے نعرے بلند کرتا ہوا منزل کی طرف چل پڑا تھا۔ اس بار مجھے خودکشی نہیں کرنی پڑی کیونکہ میں خود ہی ایک ریت کی دیوار کی طرح گرتا جا رہا تھا۔ بہت جلدی میں تھا اس لیے انتم سنسکار کا بھی انتظار نہیں کیا۔ باپ بے چارہ لکڑیوں کے لیے بھیک مانگ رہا تھا اور میں نے اس کو روتا بلکتا چھوڑ کر ایک کوئلے کی کان میں کام کرنے والے ایک محنت کش مزدور کے گھر جنم لیا۔

لوگ میرے باپ کو پادیل کہتے تھے جانے وہ کیا ہوتا ہے۔ تھوڑا بڑا ہو گیا تو سمجھ میں آیا یہ ردسی نام میرے باپ کو کسی لیڈر نے خطاب کی شکل میں دیا ہے۔ شاید اس لیے کہ وہ بالکل وہی کیا کرتا تھا جو ایک کامریڈ کو ناولوں کے خصوصی کردار میں کرنا چاہئے۔ یعنی بھوک اور پیاس کی فکر نہیں۔ اپنے گھر گرہستی کا ذکر نہیں۔ وہ صبح سے شام تک کھانستا رہتا تھا۔ مگر ہڑتالوں کی وجہ سے کان کے اندر نہیں بلکہ مالکوں کے دروازوں پر نعرے لگاتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ ماں لوگوں کے جھوٹے برتن مانجھ دیا کرتی تھی اور میری کسمپرسی کی حالت میں کیا کرتی۔ کچھ بھی ہو میں خوش تھا کہ میں ایک ایسے کارواں میں شامل ہوں جو مجھے منزل تک پہنچا دے گا۔ مجھے یقین تھا کہ مجھے اپنے جنم کی وجہ سے کوئی سزا نہیں دے گا۔ اسی لیے میں نے کبھی اپنے باپ سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ وہ کون ہے برہمن یا ہریجن۔ ہندو یا مسلمان۔

بھگوان نے میری سن لی تھی حالانکہ ان کو معلوم تھا کہ میں اس جنم میں ان کے بھگتوں کے دل و دماغ سے عقیدت یا بھگتی بلکہ دنیا بنانے والے کے وجود کے نقوش مٹا دینے کا عزم لے کر یہ جنم لے چکا ہوں مگر ہوا وہی جو ہوتا رہا ہے میرا انقلابی باپ گولی کا شکار ہو کر مر گیا اور ماں کو غریبی کے کیڑے کھا گئے۔ مگر ایک فائدہ ضرور ہوا۔ ہمارا لیڈر میرے پتاجی کی تصور اور ان پر لکھا گیا ایک ناول

بعنوان "پادیل" اپنے ساتھ لے کر روس چلا گیا اور پھر وہاں کا ہو کر رہ گیا۔ جب بھی آتا ہے تو جہاز میں بیٹھ کر آتا ہے اور جب بھی جاتا ہے تو جہاز میں بیٹھ کر اپنے ساتھ اپنے من چاہے بچوں کو لے کر۔ روس میں ڈاکٹر یا انجینئر بنانے کی خاطر۔ یوں تو ہمارا یہ لیڈر ذات کا برہمن ہے۔ پیشے سے تجارتی ہے خود کوئی کام نہیں کرتا ہے۔ مگر مزدوروں کی نمائندگی کرتا ہے۔ انقلابی باتیں کرتا ہے۔ غریب پروری کے نعرے لگاتا ہے۔ مگر جب میں نے پوچھا کہ پادیل کے بیٹے پر کیا گزر رہی ہے۔ معلوم ہوا ہے؟ تو وہ گرج کر بولا۔ وہ کہانی وہیں ختم ہو گئی ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ماں کو جب شمشان گھاٹ پر لے جانا تھا کندھا دینے والا میں ایک سولہ سال کا لڑکا تھا۔ باقی ہم سب سے ناراض تھے۔ ہم ان لوگوں کے لیے اچھوت بن گئے تھے۔ دراصل ماں کو معلوم نہیں تھا کہ انقلابی اور غدار میں کیا فرق ہوتا ہے۔ وہ بے چاری لیڈر کے منع کرنے کے باوجود کام کرتی رہی۔ نہیں کرنا چاہیئے تھا اس کو۔ تحریک میں اس نے دشواری پیدا کی تھی کیونکہ اس کی دیکھا دیکھی اور بھی عورتیں گمراہ ہو کر کام کرنے لگیں تھیں۔ اور ہڑتال کی کال کو ناکام بنایا تھا۔ یہ سب مجھ سے دیکھا نہیں گیا' سب سنا نہیں گیا اس لیے میں نے بغاوت کی۔ کاروں میں گھومنے والا' دودھ کا شراب پینے والا۔ کروڑوں کا کاروبار کرنے والا ہم لوگوں کا سوداگر کے منسٹر بن جانے والا ہمارا لیڈر نہیں ہو سکتا ہے۔ گویا اس جنم میں بھی وہی غلطی کر گیا۔ مجھے خاموش رہنا چاہیئے تھا۔ ہوا یوں کہ ایک رات جب میں کارواں میں ہی شامل تھا کسی نے مجھے دھکا دے کر ایک گہری کھائی میں پھینک دیا۔ کارواں چلتا رہا اور جب میں آخری سانس لے رہا تھا تو وہ لوگ میرا نام لے کر نعرے لگا رہے تھے۔ اور سرکار سے بدلہ لینے کا اشارہ دے رہے تھے۔ میں نے چاہا کہ کہہ دوں۔ ارے مکارو۔ مگر کیسے کہہ سکتا تھا۔ میں مر رہا تھا اور میرے جسم کو گدھ کھا رہے تھے۔

اس بار اپنے انتخاب پر شرمندہ ہو کر جب میں بھگوان کے دربار میں پیش ہوا تو منوجی کے وردھان کے مطابق مجھ سے پوچھا گیا۔ بولو اب کہاں جنم لینا چاہتے ہو۔ ؟ حالانکہ بار بار جنم لے کر بے دردی سے مارے جانے کے بعد اب نیا جنم لینے کی کوئی خواہش ہی نہیں تھی۔ مگر بھگوان بولے۔ یہ ممکن نہیں۔ آواگمن کے مطابق جس کو مرنا ہے اس کو پھر پیدا ہونا ہے۔ اگر جلدی سے تم نے اپنی خواہش کا اظہار نہیں کیا تو وردھان ختم ہو جائے گا۔ اور میں تمہیں بلی یا چوہا بنا دیتا ہوں۔ جلدی کرو' جلدی کرو۔ میں گھبرا گیا تو پوچھا پر بھو بلی یا چوہا کیوں۔ میں شیر یا بکری بھی نہیں بننا چاہتا ہوں مجھے آپ

بندر بناڈالیے ٹھیک ہے ایسا ہی ہوگا۔
لائن سے ہٹ کر جب میں نے لائن میں کھڑے دوسرے لوگوں کو دیکھا تو ایک شناسا چہرہ دیکھ کر میں چونک پڑا۔ اس لیے نہیں کہ وہ ایک نامی اسمگلر ہے بلکہ اس لیے کہ وہ اشاروں اشاروں میں مجھے قریب آنے کو کہہ رہا تھا۔ میں نے پوچھا کیا ہے؟ تو وہ بولا یہ کیا کیا تم نے؟ ارے کم بخت اتنی بڑی سفارش اور وہ بھی روپیہ دیے بغیر۔ پھر بھگوان سے مانگا بھی تو کیا۔ بندر کا جنم۔ کہہ دیتے بھگوان کسی بھی ذات برادری میں پیدا کر دو مگر میرا باپ لکھپتی ہو کروڑپتی ہو۔ یا پھر اسمگلر ہو۔ جو مورتیاں درآمد کر رہا ہو۔ لڑکیوں کو چاہے وہ ہندو ہوں یا مسلمان، برہمن ہوں یا ہریجن۔ درآمد کرتا ہو۔
دراصل یہ شخص بھی اس روز پولیس انکاؤنٹر میں مارا گیا تھا جس روز میں مارا گیا تھا۔ اس کی باتوں سے میں بہک گیا۔ کم از کم یہ اسمگلر لوگ تو جنم کی قید سے آزاد ہیں۔ کیوں نا۔ میں شاید اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرتا مگر دیکھتے ہی دیکھتے وہاں ایک ہنگامہ برپا ہوا۔ ایک شخص نے میرا حوالہ دے کر یہ مانگ کی کہ اس کو بھی اپنی پسند کا جنم ملنا چاہیے۔ اس نے کہا کہ وہ بھی افریقہ میں رہنے والے پسماندہ لوگوں کی مدد کر چکا ہے۔ اس نے بھی قحط کے دنوں درجنوں لڑکیوں کو بیوی کا درجہ تو نہیں دیا مگر بیوی کی طرح اپنے گھر میں رکھا ورنہ مر جاتیں وہ سب تڑپ تڑپ کر۔ بھگوان بلیک میل سے ڈر گئے اور پوچھا بول تمہیں کیا چاہیے۔ اس نے ایک ہی سانس میں کہا۔ مجھے کسی بھی شہر یا گاؤں میں کسی پسماندہ ذات برادری یا قبیلے کا خاندانی لیڈر بنا دیجیے۔ یعنی بے تاج بادشاہ۔ ایم۔ ایل۔ اے۔ ایم۔ پی یا منسٹر میں خود ہی بن جاؤں گا باقی سب خیریت، بچوں کو پیار۔ اپنے کئی جنموں کے حادثات کو یاد کرتے ہوئے مجھے یہی فارمولا مفید نظر آیا۔ اس لیے میں نے جونہی بھگوان سے کچھ کہنا چاہا تب میں ایک گھنے جنگل میں (جانے وہ افریقہ کا جنگل ہے یا بھارت کا) ایک درخت کی شاخ سے لٹکتا ہوا اپنے ماں باپ کی باتیں سن رہا تھا۔ ماں کہہ رہی تھی کہ میں حوّا ہوں اور باپ کہہ رہا تھا کہ میں آدم ہوں۔ میں نے پوچھا۔ میں کون ہوں تو انہوں نے بتایا ایک بندر۔ کونسا بندر۔ ہندو۔ مسلمان۔ عیسائی۔ یہودی۔ برہمن۔ ہریجن کون ہوں میں۔

ماں نے کہا ۔صرف ایک بندر۔ خوش نصیب ہو جو یہ جنم ملا۔ یہاں تمہیں کسی بات کا ڈر نہیں۔ کیونکہ نہ تو یہاں دین دھرم کی قید ہے اور نہ ذات پات کے بندھن۔ یہاں نہ کوئی امیر ہے اور نہ کوئی غریب۔ نیچے دھرتی ہے اور اوپر گگن وشال۔ یہ سن کر میں بہت خوش ہوا۔ اچانک جنگل میں کھلبلی مچ گئی۔ سب بندر گھبرا گئے۔ میں بھی جھاڑیوں میں چھپ کر ماں باپ کی باتیں سنتا رہا۔

ماں پوچھ رہی تھی۔کون ہیں یہ لوگ؟ کیا چاہتے ہیں؟ باپ نے کہا۔ یہ لوگ بندروں کو پکڑ کر امریکہ درآمد کرتے ہیں۔

امریکہ کا لفظ سن کر میں خوش ہوا۔ چلو اچھا ہے۔ اس جنم میں سکھ اٹھائیں۔ جنم جنم کے پھیروں میں بات بات پر نت نئے دکھ اٹھاتے ہیں۔ کم از کم امیر ملک میں جا کر ڈبل روٹی تو کھا سکیں گے۔

باپ نے سختی سے ٹوکا۔ نادان۔ یہ راکھشس ہیں اور وہاں بندروں کو قید کر کے ان کو بیڑیوں میں جکڑا جاتا ہے۔ ان پر تجربے کیے جاتے ہیں۔ ان کو گنی پگ بنایا جاتا ہے۔

اس بار مر جاؤں گا تو بھگوان سے یہی گزارش کروں گا کہ وہ مجھے دوسرے جنم میں مکوڑا بنا دے مگر چوہا، خرگوش، بندر، یا غریب محتاج انسان یعنی گنی پگ نہ بنائے!

لیکن پھر نئے تجربے کیسے ہوں گے؟ لگتا ہے میں ہر جنم لیتا ہوں ہو تو صرف تجربات کے لیے!
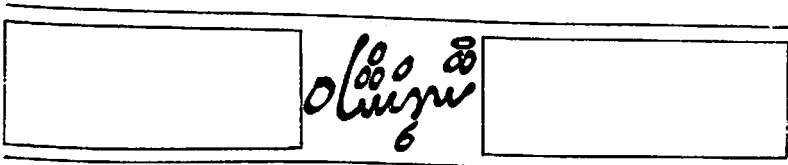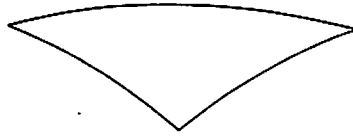
نامور اسٹار کی بات ہی نرالی ہے۔ جبھی تو لوگ اس کو اس کے نام ڈھچن کی بجائے سپر اسٹار کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ہر وقت ملک کے کروڑوں لوگ اس پر جان قربان کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ اس لیے نہیں کہ اس کی فلمیں ہٹ ہو جاتی ہیں۔ بلکہ اس لیے بھی کہ وہ غریب پرور ہے۔ جب وہ کسی فلم میں ایک زوردار گھونسہ مار کر اپنے دشمن کو ڈھیر کر دیتا ہے۔ تو منوں بوجھ اٹھا لینے والا ریلوے قلی بھی وہی ادائیں اپنائے ہوئے پٹ تو جاتا ہے مگر پھر بھی وہ اپنے پسند کے ہیرو کو دل میں بٹھا کر شیر کی طرح گھر لوٹتا ہے گویا اس کا تصور ہی ایک ایسی طاقت ہے جو گنگو تیلی کو راجہ بنا دیتا ہے۔ چند سال پہلے جب سپر اسٹار شوٹنگ کے دوران حادثے کا شکار ہو گیا تھا۔ تو اس کے پرستاروں نے اپنا سر قربان کرنا چاہا۔ لوک راج ہے اس لیے بھگوان بھی ڈر گیا تھا اور سپر اسٹار کی جان بخش دی تھی۔ ارے صاحب سپر اسٹار فقط اسٹار نہیں سپر مین بھی ہے۔ میرے گھر والے بھی ڈھچن صاحب کے چاہنے والوں میں ہیں۔ اور یقین کیجیے کہ جن دنوں ان کے دشمن ان کے بارے میں الٹی سیدھی باتیں اخباروں میں نکلواتے تھے۔ ان دنوں میرے اخبار لانے پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ لیکن اب جب کہ سب ٹھیک ٹھاک ہے میرے گھر والے یہ گنتی کرتے رہتے ہیں کہ آج سپر مین کی کتنی خبریں آئی ہیں کچھ دن پہلے تو کمال ہی ہو گیا۔ ہر اخبار کے پہلے صفحہ پر ڈھچن صاحب کے بارے میں کئی سرخیاں تھیں۔ جن میں خاص خاص خبریں یہ تھیں۔

(۱) نامور اسٹار ایک زبردست حادثے کا شکار ہوتے ہوتے بچ گئے۔ خبر رساں ایجنسی کے مطابق حادثہ اس وقت پیش آیا جب وہ آؤٹ ڈور شوٹنگ کر رہے تھے اور کسی نامعلوم شخص نے ان پر ہینڈ گرینیڈ پھینک دیا۔ دوسری خبر یہ تھی کہ نامور اسٹار اس لیے بچ گیا کہ سارے ملک کی نیک دعائیں ان کے ساتھ ہمیشہ بلڈ پروف جیکٹ کی طرح ان کے سینے سے چپکی رہتی ہیں ورنہ ایک معمولی اسپاٹ

بائے کی گردن پکڑ کر ہٹا کر دور پھینک دینے کی ہمت ہی نہ پڑتی ۔ تھوڑی دیر کر دی تھی اس لیے اس کے دونوں ہاتھ تباہ ہو گئے تھے ۔ دیر سے ایکشن کرنے والا تھا شاید اسی لیے ہیرو سے اسپاٹ بائے بن گیا تھا ۔ یہ بھی خبر میں لکھا تھا ۔

تیسری خبر یہ تھی کہ سپر اسٹار نے پریس کو بلا کر اس تخریب کاری پر پُرزور مذمت کی ہے اور فلمی دنیا سے الگ ہو کر سیاست میں حصّہ لے کر ملک اور قوم کی سیوا کرنے کا فیصلہ کیا ہے ۔ حالانکہ یہ بھی بتا دیا تھا کہ ایسا کرنے سے فلم پروڈیوسروں کو کتنے ارب روپے کا نقصان ہو گا مگر ساتھ ہی ساتھ کتنے دیش واسیوں کو فائدہ ہو گا ۔ چوتھی خبر یہ تھی کہ سپر ہیرو کی انگلی دیش کی نبض پر ہے اس لیے یقیناً وہ منسٹر بن جائیں گے ۔ شاید انفارمیشن منسٹر یا پھر ڈپٹی پرائم منسٹر ۔

پانچویں خبر یہ تھی کہ ملک کے کونے کونے سے نامور اسٹار کو ساتھ ساتھ کام کرنے فلموں میں کام کرنے کی اپیل بھی کی گئی تھی ۔ اس خبر کے ساتھ حاشیے میں ایک اطلاع بھی تھی کہ آج اس اخبار کی دس لاکھ کاپیاں چھپ گئی ہیں ۔ چھٹی خبر یہ تھی کہ اپنی غریب پروری کا بہترین ثبوت دے کر اپنا بنگلہ قیمت کا اندازہ تقریباً ایک کروڑ روپے مع سامان اسپاٹ بائے کو دیا ہے جس نے اپنے ہاتھ گنوا کر سپر اسٹار کی جان بچائی تھی ۔ اخبار میں سپاٹ بائے کا نام نہیں لکھا تھا مگر میں اس شخص کو بخوبی جانتا ہوں ۔ اس کا نام ہے برجو اور وہ اپنے آپ کو ڈچن ہی سمجھ لیتا ہے ۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ ہوائی گھوڑے پر سوار ہو کر اسٹوڈیوز کے اوپر رہتا ہے ۔ لیکن آج وہ اپنے دونوں کٹے ہاتھ دیکھ کر یوں رو رہا ہے جیسے کسی نے اس کا کھلونا توڑ دیا ہو ۔ یہی وہ ہاتھ تھے جن سے وہ اپنے بالوں کا اسٹائل شہنشاہ اسٹائل میں بنایا کرتا تھا لیکن جب میں نے اس کو اخبار دکھا کر اس بات کا یقین دلایا کہ وہ سچ مچ کا شہنشاہ بن گیا ہے تو وہ سپر اسٹار کو دعائیں دینے لگا ۔ ارے بابا یہ تو بھگوان وشنو کا اوتار ہے ۔

بنگلہ واقعی برجو کو ہی ملا جب کہ ڈرے ہوئے پروڈیوسروں نے ڈچن صاحب کے زبردست ارادے کو دیکھ کر ڈبل معاوضہ دے کر اپنی فلمیں پوری کرانے کی پلاننگ کی ۔ اس سے ڈچن صاحب کو بلیک میں کروڑوں کا فائدہ ہوا اور وہ ملک کے ہر فلمی، ادبی، سیاسی اخبار و رسالے میں یوں نظر آنے لگے جیسے پبلسٹی نہ ہوئی کسی آنے والے الکشن کی کنویسنگ ہوئی ۔ سیاسی حلقوں میں ڈچن صاحب کی مقبولیت نے بڑے بڑے سیاسی پنڈتوں اور جاگیرداروں کی گدیاں ہلا دیں اور سبھی یہی سوچنے لگے کیوں نا جوابی مقابلہ کرنے کی

بجائے راجہ پورس کی طرح سکندر کے دربار میں پیش ہوا جائے اور اپنی اپنی گدی کی حفاظت کی جائے۔ ڈچن کی سرداری قبول کی جائے اور کیا چاہیے تھا ڈچن کے صلاح کاروں کو۔ مگر ڈچن صاحب تو خدمتِ خلق کرنے کے لیے بے چین تھے۔ وہ لوگوں کے دل میں تو تھے ہی اب وہ دماغ پر بھی چھا جانا چاہتے تھے۔ واقعی ان کو کابینہ میں شامل ہونے کی دعوت دی گئی۔ ایک بہت بڑے گھر کے ایک بہت بڑے شاندار کمرے میں صوفے پر بیٹھ کر رنگ دار ٹیلیویژن پر یہ صاحب سن کر اور دیکھ کر خوش تھا۔ ایک لمحے کے لیے جب وہ دیش کے کروڑوں لوگوں کو اپنے ذہن کے سانچے میں ڈال کر دیکھتا تھا تو صرف ایک خوش حال انسان نظر آتا تھا۔ ایک خوش حال ملک نظر آتا تھا اور اپنی خوشیوں اور مسرت کے محیط سے اندر ہی اندر اور وہ دیکھ بھی کیا سکتا تھا۔ یہ تو وہ بھول ہی گیا تھا کہ وہ معذور رہے۔ لیکن کام کرتا بھی کیوں گھر میں وہ اکیلا ہی رہتا ہے۔ گھر میں عیش و آرام کا سامان ہے۔ کھانے پینے کی چیزیں، پہننے کو کپڑے اور شراب ہی شراب۔

رفتہ رفتہ نامور اسٹار کی پبلسٹی کی مہم زور پکڑتی گئی اور برجو ایک سونے کی کان میں کھو گیا۔ کھانے پینے کی چیزیں ختم ہو گئیں۔ گھر کا فون کٹ گیا۔ بجلی کٹ گئی اور رفتہ رفتہ برجو کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے سونے چاندی کی تپش سے کھیتی سوکھ گئی۔ پھر ایک دن اس قلعے کے مانند مکان میں ایک اجنبی داخل ہوا اس نے برجو کو پیٹ بھر کر کھانا کھلایا۔ شراب بھی پلائی تو برجو کو یوں محسوس ہوا جیسے چاروں طرف پھیلی ہوئی تاریکیاں ایک نقطے میں سمٹ کر کسی دریچے سے بھاگ گئیں۔ لیکن اچانک اجنبی کے چہرے کو دیکھ کر وہ چونک پڑا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے نامور اسٹار کے اوپر بم پھینکا تھا۔ برجو لرز اٹھا تو اس شخص نے اپنائیت کا احساس دلایا اور یہ کہہ دیا کہ اس نے جو کچھ بھی کیا تھا کسی کے کہنے پر کیا تھا۔ دراصل وہ بیچارہ پولیس کی نظروں سے بچ کر دن نکالا کرتا تھا اور راتیں بیابانوں میں گذارتا تھا۔

برجو کے ساتھ رہنے کی گزارش کرتے ہوئے اس نے اس کو بتایا کہ اگر دونوں ایک ہو جائیں تو بہت کچھ کر سکتے ہیں مثلاً مکان کو ہوٹل بنا سکتے ہیں۔ جوئے یا شراب کا اڈہ بنا سکتے ہیں یا پھر اونچے لوگوں کے لیے منڈی سجا سکتے ہیں۔ یا یہ بھی ممکن ہے کہ مکان بیچ کر کسی بیرونی ملک میں عیش کر سکتے ہیں۔ بلکہ روبوٹ ٹائپ کے دو مصنوعی ہاتھ لگا سکتے ہیں مگر برجو کسی بھی منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے تیار نہیں تھا وہ اس لیے کہ اس نے سمجھ سے کم از کم دس بار اس بات کی تصدیق کرائی تھی کہ رجسٹری کے مطابق مکان

برجو کی ملکیت ہے۔ مگر برجو نہ تو مکان کرائے پر دے سکتا ہے، نہ فروخت کر سکتا ہے مکان جل جائے یا تباہ ہو جائے تو بیمے کی رقم بھی برجو کو نہیں مل سکتی ہے۔

اور جب اجنبی نے برجو سے یہ شرطیں سن لیں تو اس کا آخری فارمولہ یعنی مکان کو بارود سے اڑا دینے والی بات بھی بے اثر نظر آئی غصّے سے برجو کو دھکا دے کر سیڑھیوں سے گرا کر جب وہ چلا گیا تب برجو یوں رو پڑا گویا ایک باندھ ٹوٹ کر پانی بہے جا رہا تھا۔

پھر ایک جلسے میں جب نامور اسٹار بھاشن دے رہا تھا تو اس کی نظریں برجو پر رک گئیں برجو نے حالِ دل سنایا تو ڈچن صاحب بھی رو پڑے۔

آخر یہی فیصلہ ہوا کہ برجو کو اس کی مرضی کے مطابق مکان کا دربان بنا دیا جائے اور مکان ڈچن صاحب کو واپس دیا جائے۔

برجو کو دو وقت کا کھانا ملتا رہا۔ چوکیداری بھی وہ برائے نام کرتا تھا اصل کام تو ڈچن صاحب کا کتّا کیا کرتا تھا۔ برجو صرف ٹکٹکی لگا کر آتے جاتے لوگوں کو دیکھا کرتا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے بنگلے میں چمک دمک نظر آئی۔ بنگلے میں ڈچن صاحب کے سیاسی ورکر رہنے لگے اور انہیں سیاسی ورکروں میں وہ اجنبی بھی تھا جس نے بچن صاحب پر بم پھینکا تھا۔ برجو نے ایک دن اس کو روکنا چاہا مگر ڈچن صاحب نے گرج دار آواز میں منع کیا۔ مت۔۔ لگاؤ میرے دروازے پر یہ پابندیاں یہاں عدلِ جہانگیری ہے۔ رسی کھینچنے کی ضرورت اس لیئے نہیں کہ گیٹ پر کال بیل لگی ہے۔

برجو تب سے یہی سوچ رہا ہے کہ بم پھینکنے والا سپر اسٹار کا چاہنے والا ہے۔ جمچا ہے یا پکھا اور یعنی دونوں کی صلاح ہوئی ہے یا کوئی معاہدہ!
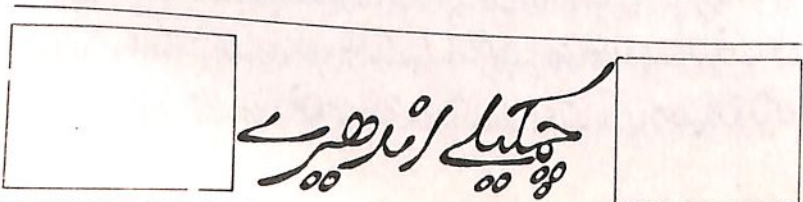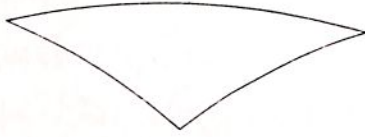
بات پرانی ہے مگر گوپی کو دیکھ کر آج یوں لگ رہا ہے گویا کل ہی کی بات ہے۔ تب کے گوپی اور آج کے گوپی میں کتنا فرق ہے تب اس کے چہرے پر انتشار کی جھلک نظر آتی تھی باتوں میں تذبذب اضطراب بے چینی اور کبھی کبھی بے کسی یا بے بسی کے مواد کے بغیر کچھ بھی نہیں ہوا کرتا تھا۔ وہ دن بھر بڑبڑاتا رہتا تھا اور اپنے مالک یا بقول اس کے مالک کے باپ کے ظالمانہ رویے سے تنگ آکر شہر سے کہیں دور بہت دور بھاگ جانا چاہتا تھا۔ دراصل اس کی منزل نیویارک شہر تھی۔ مگر کبھی کبھار وہ اپنے مالک پنڈت جانکی ناتھ کول کے گھر سے بھاگ کر میرے گھر پر کام نہیں کرنا چاہتا تھا۔ گوپی اکثر یہی کہا کرتا تھا کہ وہ ایک گھریلو قسم کا نوکر نہیں ہے بلکہ ایک کاریگر ہے بقول اس کے ایک ہنر مند باورچی اور اپنے اس دعوے کو ثابت کرنے کے لیے وہ بات سے بات نکال کر یا بات سے بات جوڑ کر کئی بڑے لوگوں کا نام لیا کرتا تھا۔ یہ بات تو وہ ہر جملے کے ساتھ جوڑ دیتا تھا کہ وہ کشمیری کھانے بنانے میں ماہر ہے اور شہر کے بڑے بڑے ہوٹل والے اس کو من چاہی تنخواہ دے کر ہیڈ کک (HEAD COOK) بنانا چاہتے ہیں۔ مگر چونکہ وہ ڈاکٹر کول کو مایوس نہیں کرنا چاہتا ہے اس لیے وہ اس کے بوڑھے سنکی باپ کی نوکری کر رہا ہے۔ مجھ پر اپنی قابلیت کا رعب ڈالنے کی خاطر وہ کبھی کبھار انگریزی کے الفاظ کا بھی استعمال کرتا رہتا تھا۔ آج بھی میں پچھلے دو گھنٹوں سے اس کی بے تکی باتیں سن رہا ہوں۔ لیکن یہ سن کر ذرا سا بھی تعجب نہیں ہوا ہے کہ گوپی نے بھی میری طرح پاسپورٹ آفس میں اپنا پاسپورٹ بنوایا ہے اور وہ ڈاکٹر کول کے پاس نیویارک جا رہا ہے۔

میں ڈاکٹر کول، ان کے والد پنڈت جانکی ناتھ اور گوپی تینوں کو جانتا ہوں ۔ ڈاکٹر کول میرا ہم جماعت تھا اور ان کے والد صاحب ہمارے پرائمری اسکول کے ہیڈ ماسٹر۔ گوپی سے میری پہلی ملاقات تقریباً تین سال پہلے سرینگر کے ہوائی اڈے کے باہر ہوئی تھی اس دن کئی دنوں کی برف باری کے بعد کچی دھوپ نکل آئی تھی۔

میرے والد صاحب بھی اسی فلائیٹ میں دلی جا رہے تھے جس میں ڈاکٹر کول جا رہا تھا۔ گوپی بھی ڈاکٹر کول کو الوداع کہنے آیا تھا مگر ہیڈ ماسٹر صاحب کو جانے کیوں گوپی کی موجودگی سے پریشانی ہو رہی تھی وہ بار بار اس کو گھر جانے کے لیے حکم دیتے تھے مگر گوپی نظریں چرا کر بار بار ڈاکٹر کول کے پاس جا کر جانے کیا رام کہانی سناتا تھا۔ جس کو سن کر ڈاکٹر کول بھی سر جھکا کر آہیں بھرتا تھا یا گوپی کو بار بار سو یا پچاس کا نوٹ دے کر منانے کی کوشش کرتا تھا۔ گوپی ہنس پڑتا اور ہیڈ ماسٹر صاحب چڑ کر بڑبڑاتے تھے۔ ایک ۷۰ سالہ بزرگ کے ساتھ ایک نوکر کا مذاق ہمیں بھی اچھا نہیں لگا تھا۔ مگر کیا کرتے جب امریکہ جانے والا بیٹا ہی مذاق میں شریک تھا۔ فلائیٹ سے پہلے جب میں نے اپنے والد کے پاؤں چھوئے تو میری آنکھیں بھیگ گئیں تھیں مگر یہ دیکھ کر ہیڈ ماسٹر صاحب نے کشمیری، ہندی، اردو اور انگریزی زبان کے محاوروں کا سہارا لے کر مجھے یہ بات سمجھا دی کہ انسان کو کمزور لمحوں کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ واقعی ہیڈ ماسٹر صاحب بالکل نہیں روئے جب ان کا بیٹا وداع لینے لگا مگر جب جہاز چل پڑا جانے وہ گوپی کو ڈانٹتے ڈانٹتے کیوں بچوں کی طرح رو پڑے۔

ہیڈ ماسٹر صاحب کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار نکل کر جب ان کے پچکے گالوں کو چھونے لگی تو میں بھی جذبات کی رو میں بہہ گیا۔ مگر اچانک جب گوپی کے قہقہوں نے احساسات کا سلسلہ توڑا تو میں نے نہ صرف گوپی کی اس بے ہودہ حرکت کی مذمت کی بلکہ اس کو سختی سے ٹوکا بھی۔ وہ خاموش نہ رہتا تو شاید میرا ہاتھ بھی اٹھتا۔ بس اسی دن سے گوپی گویا مجھ سے چپک گیا تھا۔ روز میرے گھر پر آیا کرتا تھا۔ اور بس ایک ہی دکھڑا سناتا تھا۔ آپ کے ہیڈ ماسٹر صاحب یہ کرتے ہیں۔ وہ کرتے ہیں بس یوں میں ایک بوڑھے مالک اور جوان نوکر کے درمیان پھنس گیا تھا۔ یہ دیکھ کر کہ گوپی میرے پاس آتا جاتا ہے ہیڈ ماسٹر صاحب نے بھی روز ملاقات کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ دونوں ہی ایک دوسرے پر ایسی الزام تراشی کرتے رہتے تھے کہ مجھے کبھی کبھی غصہ آجاتا تھا۔ آج گوپی پر تو دوسرے دن ہیڈ ماسٹر صاحب پر۔

گوپی کہا کرتا تھا کہ بوڑھا چین سے نہیں بیٹھنے دیتا ہے۔ بلڈ پریشر کا مریض ہے لیکن پھر بھی سبزی میں تیز نمک ڈالنے کو کہتا ہے۔ نمکین چائے مانگتا ہے۔ دوائیاں وقت پر نہیں کھاتا ہے۔ ویڈیو پر فلمیں نہیں دیکھنے دیتا ہے حالانکہ V.C.R ڈاکٹر کول نے فقط منورنجن کے لیے بھیجا ہے۔ بجلی کی بچت

کے چکر میں ہیٹر، ٹوسٹر، فرج یا دوسری آرائش کی چیزیں استعمال نہیں کرنے دیتا ہے۔ قالین پر پاؤں رکھ دو تو وہ شیر کی طرح گرجتا ہے۔ حالانکہ گھر میں چاول کی کئی بوریاں پڑی ہیں بوڑھا مجھ سے راشن کارڈ پر چاول منگواتا ہے میں صاحب کی پرانی قمیص پہن لیتا ہوں تو بوڑھا قمیص یا کوٹ چھین کر ٹرنک میں رکھ دیتا ہے۔

اپنی روداد سنا کر گوپی یا تو بلاوجہ ہنس پڑتا تھا یا پھر رو پڑتا تھا۔ رہی بات ہیڈ ماسٹر صاحب کی تو وہ اپنی گفتگو کا آغاز ایک دانشور کی طرح کرتے تھے۔ شیخ سعدی یا دوسرے اُردو، فارسی یا سنسکرت کے مفکروں اور دانشوروں کے حوالے سے باتیں کرتے تھے فلسفوں کی چاشنی میں بہت ہی اچھی اچھی باتیں کرتے تھے اور پھر اچانک گوپی کی بیہودہ حرکتوں کا ذکر یوں کر دیتے تھے گویا گوپی گھر کا نوکر نہیں بلکہ ایک امریکی ایجنٹ ہے جو ہیڈ ماسٹر صاحب کو ختم کرنے کی ترکیبیں سوچتا رہتا ہے اور ناکام ہو کر زخمی سانپ کی طرح بار بار ڈنک مارنے کی کوشش کرتا ہے۔ بقول ان کے اس نالائق اور نامعقول شخص سے میں کہہ دیتا ہوں کہ برآمدے کی بجلی بند کر دو تو وہ الٹا آنگن کی بجلیاں جلا دیتا ہے۔ دن بھر گانے گاتا ہے۔ میں چاول مانگوں تو وہ روٹیاں دیتا ہے۔ ارے کیا ہوا جو مجھے شکر کی بیماری ہے۔ میں کیا یہ نہیں جانتا کہ چاول منع ہے۔ مگر وہ کون ہوتا ہے مجھے بھاشن دینے والا۔ کہہ رہا ہے کہ میں امریکہ جاؤں گا۔ کم بخت کوئی لکھ پتی سیٹھ ہے۔

ہیڈ ماسٹر صاحب کی تلخ باتیں فقط یہ نہ سمجھاتی رہتی تھیں کہ وہ گوپی سے خفا ہیں۔ بلکہ وہ اپنے بیٹے سے خفا ہیں۔ شاید اس لیے کہ بیٹا ڈاکٹر تو بن گیا امریکی مریضوں کے لیے کبھی کبھی ہیڈ ماسٹر صاحب ایک معصوم بچے کی طرح رو پڑتے تھے۔ ان کی حالت دیکھ کر جب میں نے ڈاکٹر کول سے رابطہ قائم کیا تو انہوں نے اپنی روداد لکھ بھیجی۔ بقول ان کے وہ اپنے بوڑھے باپ کی صحت کے بارے میں سخت پریشان رہتے تھے۔ دوائی کھائی یا نہیں بس یہ سوال اکثر ان کو بے چین کر دیتا ہے۔ سردیوں میں کسی نے ان کو کانگڑی دی یا نہیں، چائے پلائی یا نہیں بس یہی غم ان کو ہر وقت اندر ہی اندر کریدتا رہتا ہے۔ مگر چونکہ ان کی دیکھ بھال کی خاطر منہ مانگی قیمت دے کر گوپی کو رکھا ہے اس لیے ان کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ باپ اور بیٹے کے احساسات، جذبات و خیالات سے یہ بات تو سمجھ میں بہت پہلے آگئی تھی کہ دونوں ایک دوسرے سے بہت پیار کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کے بغیر رہنا نہیں چاہتے مگر کوئی دونوں کی کیفیت سمجھتا ہے۔ باپ کشمیر نہیں چھوڑنا چاہتا ہے اور بیٹا امریکہ سے واپس لوٹ کر نہیں آنا چاہتا ہے۔ پھر ہیڈ ماسٹر صاحب آخر چاہتے کیا ہیں۔ گوپی روز یہی رٹ لگاتا رہتا تھا کہ ایک

بار میں گھر چھوڑ کر جاؤں بس بوڑھا خوش و خرم نظر آئے گا۔ پھر تم جانتے کیوں نہیں۔ میں اکثر یہ سوال پوچھتا رہتا تھا۔ گوپی نہایت دردناک لہجے میں جواب دیتا تھا۔ کیا کروں ڈاکٹر صاحب نے قسم دی ہے۔ ورنہ کب کا اس جہنم سے آزاد ہوا ہوتا اور پھر ڈاکٹر صاحب نے وعدہ بھی کیا ہے۔ بوڑھا جب سورگ لوک سدھارے گا تب وہ مجھے امریکہ لے جائیں گے۔ بحیثیت نوکر نہیں بلکہ بحیثیت ایک ہنرمند باورچی کے جو کشمیری وازوان کا ماہر ہے۔ رستہ بناتا ہے گوشتابہ بناتا ہے۔

ہیڈ ماسٹر صاحب کے بارے میں ایک بار محلے والوں سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ محلے کا واحد خوش بخت انسان ہے۔ جھونپڑی میں رہنے والا دیکھو تو ایک عالیشان محل میں رہتا ہے۔ بیٹا امریکہ سے ڈالر بھیجتا رہتا ہے۔ طرح طرح کی مشینیں بھیجتا رہتا ہے بجلی پر چلنے والی لحاف۔ چولہے۔ کیا کچھ نہیں ہے اس ماسٹر کے پاس۔ بس عادتاً روتا رہتا ہے۔

مختصراً یہ کہ میں دو سال کے عرصے میں کبھی یہ نہیں جان پایا کہ ہیڈ ماسٹر صاحب اور گوپی میں کون نامعقول ہے اس لیے میں دونوں سے دور دور رہنے لگا۔ بلکہ میں نے ڈاکٹر کول سے بھی خط و کتابت کا سلسلہ بند کر دیا۔ آخر روز روز کی پریشانی سے تب آزادی مل ہی گئی جب میرا تبادلہ ہو گیا۔ آج تقریباً تین سال کے بعد جب گوپی نے مجھے دیکھا تو شاید وہ مجھ سے گفتگو کرنے کے لیے تیار نہیں تھا مگر میں نے آواز دی تو عادتاً اس کا ٹیپ ریکارڈ آن ہو گیا اور وہ بس بولتا ہی رہا آخر میں نے ہیڈ ماسٹر صاحب کے بارے میں پوچھ ہی لیا ان کا نام سنتے ہی گویا گوپی کو سانپ سونگھ گیا۔ آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے اور وہ دبی دبی آواز میں یوں بولنے لگا گویا اس کے منہ سے الفاظ اس کے سینے کو چیر چیر کر باہر آرہے ہوں۔

صاحب ایک دن بوڑھے نے مجھے نکال ہی دیا۔ میری غلطی یہ تھی کہ میں نے کمرے سے بجلی کا ہیٹر نکال دیا تھا اور بستر گرم کرنے کی خاطر ربڑ کی بوتل دی تھی۔ کیا کرتا گھر تو چھوڑ کر آیا مگر ڈاکٹر صاحب کو دیا ہوا وعدہ یاد آتے ہی واپس چلا جاتا۔ دہلیز پر رک کر بوڑھے کو دیکھتا رہتا تھا۔ کلیجہ منہ کو آتا تھا۔ جب بوڑھا اپنے ہاتھوں کی لرزش پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے گیس جلاتا تھا۔ بجلی کے لحاف کا پلگ فٹ کرتا تھا۔ پھر ایک دن جب صبح سویرے میں بوڑھے کو دیکھنے گیا تو محلے والے صحن میں کھڑے تھے۔ اور پولیس دروازہ توڑ کر اندر جانے کی کوشش کر رہی تھی۔ رپورٹ محلے والوں نے ہی کی تھی کیونکہ بدبو چار سو پھیل گئی تھی۔

دروازہ توڑا گیا تو بوڑھا ابدی نیند سو رہا تھا۔ کسی نے بتایا کہ بجلی کی لحاف کا پلگ فٹ کرتے وقت بوڑھے کو بجلی کا شاک لگا ہوگا۔

یہ کہہ کر گوپی زار و قطار رو پڑا اور میں یہ دیکھ کر سوچ رہا ہوں کہ گوپی کیا واقعی ایک نامعقول نوکر تھا۔

ماں
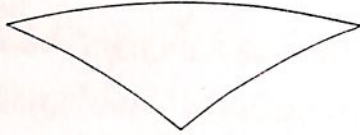
ماں جب ہنستی ہے تو ماتم چھا جاتا ہے اور جب وہ روتی ہے تو اس کے چاہنے والے اس کے
آنسوؤں کو ایک اچھا شگون سمجھ کر خوشی سے جھومنے لگتے ہیں۔ انہیں ماں کی روحانی طاقت پر بھروسہ ہے
کبھی وہ اسے پگلی کی بجائے پگلی ماں یا فقط ماں کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ عقیدت مند لوگ اس کے چہرے
کی افسردگی یا مسرت کے تاثرات میں اپنی تقدیر کا عکس دیکھتے رہتے ہیں، اپنے سوالات کا جواب تلاش کرتے
رہتے ہیں۔ طالب علم اپنا نتیجہ، عاشق اپنا انجام، ماں اپنے ہونے والے بچے کی جنس اور تاجر اپنا مقدر ماں کے
چہرے میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ گویا حالات کا جواب ماں کے قہقہے عیاں کر دیتے ہیں یا اس کے
آنسو بیان کر دیتے ہیں۔ اس سائنسی دور میں ایک معمولی سی عورت کے پاس اتنی طاقت کیسے آگئی؟ یہ
کوئی فریب یا مکاری تو نہیں۔ میں اکثر سوچتا رہتا ہوں لیکن کبھی کبھی میری معقول سوچ سمجھ میری
پریشانیوں کا بوجھ اٹھاتے اٹھاتے تھک کر خود ہی وہم کے دلدل میں پھنس جاتی ہے تو میرا اعتماد بھی
اعتقاد کے سامنے جھک جاتا ہے اور تدبیر تقدیر کے سامنے ہتھیار ڈال دیتی ہے۔ میں ایک نامور بچوں کا
ڈاکٹر ہوتے ہوئے بھی اپنے اکلوتے بیٹے کی خاطر پیروں کے آستانوں، فقیروں کے مزاروں اور یہاں تک کہ
کبھی کبھی پگلی ماں کے آگے پیچھے گھومتا پھرتا ہوں۔ آخر ایک بے بس ڈاکٹر، ایک دل شکستہ باپ کی
رائے قبول نہ کرے، یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے؟

ماں تقریباً روز ہی میرے گھر آتی ہے۔ برآمدے میں ٹہلتے ٹہلتے وہ اکثر کھڑکی سے جھانک کر میرے
بیٹے کو دیکھ کر مسکراتی رہتی ہے اور اس کا مسکرانا عام اعتقاد کے مطابق میرے بیٹے کی بدنصیبی کی عکاسی کرتا
ہے۔ میرا بیٹا واقعی بدنصیب ہے۔ ورنہ کیا وہ دس سال کی عمر میں بھی چل پھر نہیں سکتا؟ پولیو کا علاج نہیں۔
یہ تو ایک عام آدمی بھی بخوبی جانتا ہے لیکن میں ماں کا چہرہ دیکھ کر ہر بار یہی امید کرتا ہوں کہ شاید ماں آنسو بہا

دے اور میرے بچّے کی پتلی پتلی ٹانگیں حرکت میں آنے لگیں اور پھر میرا منا دوڑے گا، کھیلے گا۔ کرکٹ، بیڈمنٹن، سائیکل پر سوار ہو کر ریس کرے گا۔ کار چلائے گا لیکن ماں روئے گی نہیں اور میرا لڑکا بستر پر ایک زندہ لاش کی طرح ہی پڑا رہے گا۔ ماں جب چلی جاتی ہے تو میں یہی سوچ کر اپنے لب سی لیتا ہوں۔

آج بھی ماں میرے برآمدے میں ٹہل رہی ہے مگر مسکرانے کی بجائے آج وہ اپنی چھاتی پیٹ پیٹ کر زار زار رو رہی ہے۔ لوگ ماں کو اس حالت میں دیکھ کر اپنی اپنی مرادیں لے کر اس کے گرد جمع ہونے لگے ہیں۔ انہیں ماں پر پورا بھروسہ ہے۔ آخر کیوں نہ ہو۔ اعتقاد انسان کو لاکھ اندھا بنا دے مگر جانے پہچانے راستوں پر چلنے کا ہنر بھی تو سکھا دیتا ہے۔ ماں نے بھی ان کو ایک آزمائے ہوئے راستے پر چلنا سکھایا ہے۔ پھر وہ کسی نئے راستے کی کیوں تلاش کریں۔ یہ سوچ کر میں بھی اسی راستے پر چلنے لگا تھا لیکن ماں کا اصلی روپ دیکھ کر میں نے یہ راستہ بدل دیا۔

ماں کون ہے، شاید شہر میں کوئی نہیں جانتا لیکن میں نے اسے پہچان لیا ہے۔ اس کا اصلی روپ اس روپ سے کتنا مختلف ہے یہ جاننے کی کسی کو فرصت ہی کہاں ہے۔ لیکن میں آج ماں کا اصلی روپ عیاں کر دوں گا۔

پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس، میلی کچیلی، چھوٹے سے قد کی یہ عورت دن کو اکثر گلی کوچوں میں گھومتی رہتی ہے۔ لیکن رات کو وہ غائب ہو جاتی ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہاں ہے۔ لیکن میں جان چکا ہوں۔

دن کو لوگوں کے گھروں میں بنا روک ٹوک داخل ہونا۔ کھڑکیوں سے اسکول کے بچّوں کو چوری چھپے جھانک جھانک کر دیکھنا۔ چھوٹے چھوٹے بچّوں کو پکڑنے کی خاطر ان کے پیچھے بھاگنا یا پھر سڑک کے بیچ کھڑی ہو کر جنگلی بلیوں کی طرح غرّانا اس کا معمول ہے کبھی کبھی وہ بیہودہ حرکتیں بھی کرتی ہے۔ لیکن لوگ اس کی بیہودگی کو نظر انداز کر کے فقط اس کے چہرے کے تاثرات دیکھتے رہتے ہیں۔ اگر ماں قہقہے لگائے تو گویا کسی ناگہانی آفت کے قدموں کی آہٹ سنائی دینے لگتی ہے اور اگر وہ رونا شروع کر دے تو سڑک کا ہجوم ایک کارواں بن کر اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہتا ہے۔ گویا کسی جھانکی کے پیچھے ایک جلوس جا رہا ہو۔ ماں کہاں سے آئی ہے، اس کا کوئی وارث ہے بھی یا نہیں یہ کوئی کس سے پوچھے اور بھلا کون بتلائے۔ ماں خود تو بول نہیں سکتی۔ فقط سیٹی بجاتی ہے اور وہ بھی ایسے جیسے کسی کا دل بہلانے کے لیے کوئی دھن بجا رہی ہو۔

ماں کو اس شہر میں آئے تقریباً ۵ سال ہو گئے شروع شروع میں لوگ اس کی حرکتوں کو عیب سمجھ کر اسے تنگ بھی کرتے تھے۔ اور کبھی مارتے پیٹتے بھی تھے لیکن اب ان معیوب حرکتوں کو متبرک درشن سمجھ کر دہ اپنا سر تسلیم خم کیے دیتے ہیں۔ خاص طور پر جب وہ اپنے دانت پیستے ہوئے دائیں بائیں اور نیچے سر ہلا کر یوں چیخ پڑتی ہے جیسے اس پر کوئی دورہ پڑا ہو، ماں پر جب بھی کبھی ایسی کیفیت طاری ہوتی ہے تو وہ کسی نہ کسی مرد یا عورت، جوان یا بوڑھے، بچے یا سڑک پر لگنے بجلی کے کھمبوں سے چمٹ کر اپنی قمیص اوپر اٹھاتی ہے اور اپنے پستان دکھا دکھا کر کچھ سمجھانے کی کوشش کرتی ہے پھر بے بس ہو کر یوں دوڑتی ہے جیسے کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہو یا خود وہ کسی کے پیچھے بھاگ رہی ہو۔ کبھی وہ فٹ پاتھ پر لیٹ کر اپنی عریاں چھاتیوں کو اپنے ہاتھوں سے مسلتی رہتی ہے۔ لیکن اس بیہودہ پن کو دیکھ کر بھی اس کی روحانیت پر یقین نہ رکھنے والے بھی اس کو روکنے یا ٹوکنے کی ہمت نہیں کر سکتے۔ ماں کی کیفیت ایک سیلابی دریا کے مانند ہے۔ اس کو کوئی روکے بھی تو کیسے؟ وہ ننگی ہو کر برقی تار بن جاتی ہے اور چھونے والا خوفزدہ ہو جاتا ہے۔ ایک بار جب ایک پولیس مین نے اسے زبردستی پکڑ کر قمیص پہننے پر مجبور کیا تھا تو لوگوں نے اگلے ہی لمحے شیر کی طرح گرجنے والے سپاہی کو ٹرک کے نیچے تڑپتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ ماں کا قہر تھا جو سپاہی پر ٹوٹا تھا۔ محلے کے ایک بدکردار جنس زدہ لڑکے نے ایک دن پیار سے ماں کی چھاتی کو چھو لیا تو ماں ایک پالتو بلی کی طرح اس کے ساتھ چمٹ گئی۔ زمین پر لیٹ کر اس نے اس لڑکے کو جب اپنے سینے سے لگایا تو لڑکے نے جانے کیا کیا تھا کہ ماں زور سے چیخ پڑی۔ لڑکا ڈر گیا اور ماں کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ اس روز دن بھر وہ اس لڑکے کے دروازے کو پکڑ کر قہقہے لگاتی رہی۔ اسی رات محلے میں آگ کی زبردست واردات ہوئی جس میں وہی لڑکا جھلس کر مر گیا۔

ماں کے ایسے بہت سے واقعات مشہور ہیں۔ اور اس کے رونے دھونے سے وابستہ کتنی ہی کہانیاں سنی جاتی ہیں۔ لازمی طور پر ماں کا میرے برآمدے میں زار زار رونا مجھے اپنے لیے ایک اچھا شگون سمجھنا چاہیے تھا، مگر میں نے ایسا نہیں سمجھا۔ ماں کا اصلی روپ دیکھ کر آج میں خوش ہونے کے بجائے اپنے آپ سے خوفزدہ ہو رہا ہوں اور صرف رونا چاہتا ہوں۔

کل کی بات ہے۔ میری بیوی منے کو جب ہماچل پردیش میں رہنے والے کسی درویش کے پاس لے گئی تو میں اسٹیشن سے لوٹتے ہی بستر پر نیم دراز اپنے بیٹے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ کسی کے قدموں کی

آہٹ نے مجھے چونکا دیا اور ماں تقریباً دوڑ کر جب میرے بیڈ روم میں داخل ہوئی تو میں ایک گیند کی طرح اچھل پڑا۔ ماں کی صورت بہت ڈراؤنی تھی۔

اس کے ہاتھ پاؤں، جسم کے عریاں حصے سب تارکول سے کالے ہو گئے تھے۔ بال ماتھے سے چپک گئے تھے اور وہ آنکھیں دائیں بائیں یوں گھما رہی تھی جیسے بلی چوہے کی تلاش کر رہی ہو مجھے دیکھتے ہی وہ مسکرانے لگی اور میز پر رکھی منّے کی تصویر کو دیکھ کر جب وہ قہقہے لگانے لگی تب وہم کے جھٹکوں سے میری امید کا آخری مینار بھی ٹوٹتا نظر آیا۔ میں نے سوچا کہ اب میرا بیٹا ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ میں اپنے جذبات و احساسات کو تھپکیاں دے دے کر سلانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ ماں کے چہرے میں امید کی کرن دیکھنے کے لیے اس کے بھیانک چہرے کو یوں تک رہا تھا جیسے مندر پر سجائی ہوئی مورت سامنے رکھی ہوئی ہو۔ کاش ماں پھوٹ پھوٹ کر روتی میں اپنی نم آنکھوں کو صاف کرتے ہوئے بار بار سوچتا رہا۔ دل ہی دل میں فریاد کرتا رہا اور ملتجی نظروں سے ماں کے چہرے کو دیکھتا رہا کہ شاید ماں رو کر میرے حق میں فیصلہ سنا دے۔ لیکن ماں کسی چیز کی تلاش میں تھی اور پھر وہ کسی چیز پر ایسے جھپٹ پڑی جیسے بلی نے چوہے کو دبوچ لیا ہو اور اسے اپنی قمیص کے نیچے چھپا کر تیزی سے باہر نکلی اور تیز رفتار سے بھاگتی رہی۔ میں بھی بنا کچھ سوچے سمجھے اس کے پیچھے سرپٹ دوڑتا رہا، دوڑتا رہا۔

شہر سے دور جب ہم دونوں شمشان کے وسیع احاطے میں داخل ہوئے تو ماں کے قدم رک گئے۔ اچھل اچھل کر مردوں کی طرح دوڑنے والی یہ عورت سنجیدگی سے سنبھل سنبھل کر چلنے لگی۔ اس کی یہ حرکت دیکھ کر میں پسینے سے شرابور ہو گیا، میرے ہونٹ سوکھ گئے اور حلق میں کانٹے پڑ گئے۔

زمین میں کچھ دفن کرنے کے بعد وہ یوں چیخ پڑی جیسے ایک کھوکھلا درخت تیز ہوا کے جھونکے سے ٹوٹ کر گر پڑا ہو اور پھر سسک سسک کر روتے ہوئے میرے سامنے سے اس طرح گزر گئی جیسے میں ایک درخت کا کٹا ہوا تنا ہوں۔ بے معنی۔

کیا یہ بھی ماں کا کوئی کرشمہ ہے۔ ماں کی اس کیفیت کو اپنی تقدیر کا فیصلہ قبول کرنے سے پہلے میں ماں کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ یہاں کیا کرنے آئی تھی۔ ہمت باندھ کر جب میں نے اسی جگہ کو پھر کھودنا شروع کیا تو زمین کی تہیں کاٹتے کاٹتے مجھے سب سے پہلے میرے ہی گھر سے چرائی ہوئی روٹی ملی اور پھر گلی سڑی ساڑیوں کے علاوہ دودھ پلانے کی بوتلیں کھلونے وغیرہ اور آخر میں ایک ہڈیوں کا ڈھانچہ دو یا تین سال کے ایک

بچے کا ڈھانچہ۔
اور اب ماں کا اصلی روپ میرے سامنے آچکا تھا۔ وہ ڈھانچہ یقیناً اس کے بچے کا تھا جس کے لیے وہ روٹی کے ٹکڑے، کھلونے، رنگین شیشے پتہ نہیں کیا کیا سڑکوں پر اکٹھا کرتی پھرتی ہے۔ پتہ نہیں وہ بچہ سیلاب کا شکار ہوا تھا یا طوفان کا یا بھوک کی وجہ سے تڑپ تڑپ کر مر گیا تھا۔ ماں رو رہی ہے۔ اس کے آنسو دیکھ کر لوگوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ اس کے عقیدت مند خوشیاں منا رہے ہیں اور کسے کیا پتہ کہ ماں مٹی میں ڈھکے ہوئے ڈھانچے کے لیے آنسو بہا رہی ہے۔ دل تو چاہتا ہے کہ اس کے آنسو پونچھ دوں لیکن سوچتا ہوں، اگر ماں کے رونے سے واقعی نصیب بدلتے ہیں تو میں کیوں اسے روکوں شاید ہماچل پردیش کے درویش کے پاس کوئی ایسی دوا یا دعا ہو جس سے منا ٹھیک ہو جائے اور پھر وہ دوڑنے لگے کھیلنے لگے کرکٹ، فٹ بال، بیڈ منٹن، وہ کار چلائے میں اسے پائلٹ بنا دوں۔ پھر میرے بچے کی پتلی پتلی ٹانگیں میری نظروں میں گھومنے لگیں۔ ماں چیخ اٹھی اور میں مٹی میں دبا ہوا بچے کی ہڈیوں کا ڈھانچہ دیکھ کر خود بھی چیخ پڑا۔
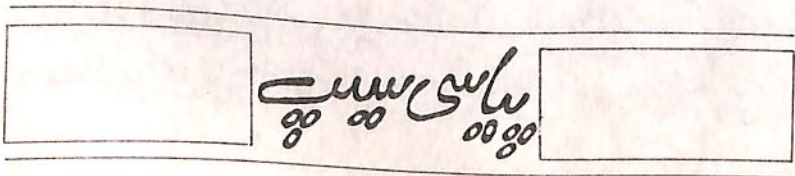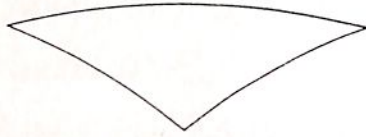
وہ یونیورسٹی کی قابل ترین پروفیسر ہے۔ لیکن اس کے اطوار وانداز نرالے ہیں۔ جب دیکھو بے رونق چہرہ۔ بے ترتیب بال۔ بدن پر ڈھیلے ڈھالے کھادی کے کپڑے۔ ہاتھ میں وزنی کتابیں لیے، کھوئی کھوئی رہتی ہے۔ خدا جانے یہ جذبات کی کشمکش ہے یا خیالات کی گھٹن۔ لیکن اس کا حلیہ دیکھتے ہی بے ساختہ ہنسی آجاتی ہے۔ سنجیدگی نے اس کے چہرے کے تاثرات کو مفلوج کر کے اسے پتھر کی ایک مورت بنا دیا ہے۔ اس کے ہونٹوں پر خاموشی کی مہر لگی رہتی ہے۔ کلاس روم کے سوا وہ شاید ہی کسی سے بات کرتی ہے۔ اس کا رہن سہن بھی عام لوگوں سے مختلف ہے۔ آس پاس کے ماحول۔ رسم رواج سے کنارہ کشی اختیار کر کے ایک چھوٹے سے کمرے میں موٹی موٹی کتابوں کا مطالعہ کرتی رہتی ہے۔ یہی اس کا محبوب مشغلہ ہے اور روز مرہ کی زندگی بھی۔ کبھی کبھی رات کی تنہائیوں میں وہ اپنے تان پورا کو گلے سے لگا کر ساز چھیڑتی ہے یا پھر ساز کے ساتھ آواز کو ہم آہنگ کر کے گاتی بھی ہے۔ اس کی آواز میں کتنا سوز ہے۔ الفاظ میں کتنا درد ہے اس کا طرزِ بیان ہی ایک فریاد ہے۔ آس پاس کے لوگوں کو اس ساز و آواز کے ساتھ اکثر سسکنے کی آواز بھی سنائی دیتی ہے۔ وہ لوگ اسے کوئی روحانی عمل سمجھتے ہیں۔ شاید یہ تڑپ ہی اس کی تپسیا ہے۔ سسکنا ہی بھگتی ہے جبھی تو لوگ اسے ڈاکٹر چنچل شرما کی بجائے "میرا جوگن" کہتے ہیں۔ کوئی اسے دانشور بھی کہتا ہے۔ کوئی مفکر لیکن عام لوگوں کی نظروں میں وہ ایک خدا دوست پاک باطن خاتون ہے۔ ایک بلند پایہ زاہدہ!

یونیورسٹی میں وہ پچھلے دس سال سے کام کرتی ہے لیکن آج تک کوئی نہیں جانتا وہ کون ہے؟ کہاں سے آئی ہے؟ اس کا کوئی اور بھی ہے یا نہیں۔ کیونکہ وہ اپنی ذات کے بارے میں کسی سے ذکر کرتی ہے اور نہ کسی کو اس کے بارے میں جاننے کی فکر ہے۔ جہاں سے بھی گزرتی ہے جیسے نمائش کے لیے ایک چلتا پھرتا تابوت ہو۔ شاید ہی کسی نے اسے ہنستے یا مسکراتے دیکھا ہو۔ لیکن آج اس کے چہرے پر مسرت رقص کر رہی

ہے۔ پتھر جیسے ہونٹوں پر تبسم ہے۔ آنکھوں میں چمک، وہ اونچی ہیل کی سینڈل پہن کر مٹک مٹک کر ایسے چل رہی ہے جیسے ایک تتلی، ایک پُر بہار گلستاں میں گلوں کو چوم چوم کر خوشی سے جھوم کر اڑتی پھرتی ہو۔ شاید اسی لیے آس پاس کی ہر مشکوک نظر اسے آج جھانک جھانک کر دیکھ رہی ہے۔ ہر دیوار کے پیچھے سرگوشیاں ہو رہی ہیں لیکن وہ آس پاس کے ماحول سے بے فکر ہلکے سُروں میں گنگناتے ہوئے بہت چاؤ سے اپنے کمرے کو سجا رہی ہے۔

یوں تو اس کا کمرہ مختلف کتابوں، رسالوں، کاغذات کے پلندوں سے بھرا پڑا رہتا ہے لیکن آج یہی کمرہ ایک مصور کی آرٹ گیلری کی طرح سجا ہوا ہے فرش پر دلکش کشمیری قالین، ویلویٹ کے زرق برق کرتے ہوئے صوفے اعلیٰ ڈیزائن کے خوبصورت پردے۔ کمرے کے ایک کونے میں وینس کا قدِ آدم مجسمہ اور دیوار پر ایک پُر کشش کینواس۔ خدا جانے آج تک یہ سبھی چیزیں اس نے کہاں چھپا رکھی تھیں۔ سوہنی اور مہیوال کی اس تصویر کو اپنی ساڑی کے پلّو سے صاف کرتے ہوئے نہ جانے اس کے ہاتھ کیوں کانپنے لگے۔ جیسے کسی اجنبی سے ہاتھ ملاتے ہوئے اسے اپنائیت کا احساس ہو رہا تھا حسرت بھری نگاہوں سے تصویر کی گہرائیاں ناپتے ہوئے اچانک اس کے کانوں میں ایک مدھر سُر گونجنے لگا جیسے کوئی پیغام تھا۔ جو اس کے تھرتھراتے لبوں کو نغمۂ دل چھیڑنے کے لیے اکسانے لگا تھا۔ اس کا دل دھڑکنے لگا اور دل کی ہر دھڑکن کے ساتھ ساز بجتے رہے۔ وہ تصویر کے رنگوں میں کچھ ڈھونڈتی رہی۔ کچھ سمجھتی رہی۔ کچھ محسوس کرتی رہی — سازوں میں پیار تھا، محبت تھی۔ رنگوں میں محبوب تھا محبوبہ تھی۔ اس کے جسم میں گدگدی ہونے لگی۔ اپنے ٹھنڈے جسم میں کسی ان دیکھی آگ کی ہلکی ہلکی آنچ کی تپش سے رگ رگ میں حرارت محسوس کرتے ہی اس کی آنکھوں سے نشہ چھلکنے لگا اور وہ ایک الھڑ دوشیزہ کی طرح صوفے پر دراز ہو کر انگڑائیاں لینے لگی جیسے ایک نازک غنچہ کھلنے کے لیے بے تاب تھا یا کسی کو چھونے کے لیے بے قرار اچانک اپنے جسم سے ایک ایک کپڑا اتارتے ہوئے اسے اپنے مایۂ ناز کردار سے نفرت ہونے لگی۔ نفرت کے اس احساس کے ساتھ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ ایک دلدل سے نکل کر ایک وسیع میدان میں ایک ہرن کی طرح دوڑتی جا رہی ہو۔ لاوے جیسی شدت لیے وہ اپنی موٹی موٹی کتابوں کو ٹھوکریں مارتے ہوئے اپنے لباس کو فرش پر گرا کر باتھ روم میں لگے قدِ آدم آئینے میں اپنے عریاں جسم کو مختلف زاویوں سے دیکھتی رہی۔ موتی جیسے پانی کے قطروں کو اپنے بدن پر پھسلتے دیکھ کر وہ شاور کے جھرنے کے نیچے مورنی کی طرح ناچتی رہی اور کوئل کی طرح گاتی رہی۔

میک اپ سے اسے اتنی نفرت ہے کہ یونیورسٹی کی لڑکیاں سبھی اس کی موجودگی میں اپنے ہلکے سے ہلکے ــــ
میک اپ کو چھپاتی رہتی ہیں۔ لیکن آج اس کے اپنے ڈریسنگ ٹیبل پر اعلیٰ سے اعلیٰ قسم کے کریم پاؤڈر تیل سینٹ
اور لپ اسٹک ہیں وہ بار بار اپنے بالوں کے اسٹائل، آنکھوں کے کاجل، ماتھے کی بندیا، گالوں کی سُرخی،
ہونٹوں کی لالی، کانوں کے آویزے دیکھ کر مسرور نظر آرہی ہے۔ ایک جدید ڈیزائن کا منی بلاؤز پہن کر جب
اس نے ایک خوبصورت سا ہار گلے میں ڈالا تو ذرا سا جھک کر اسے ایسے محسوس ہوا جیسے وہ ہار اس کے نیم عریاں
سینے کے ابھار سے ٹکرا کر ویسے ہی اچھل رہا ہو جیسے سنگ مرمر کی چٹانوں سے ٹکراتا ہوا ایک دلکش آبشار،
شسفان کی سرخ رنگ کی ساڑی پہن کر وہ ساڑی کی پرکشش گلکاری انگور کے گچھوں کے مانند جھالر
کو دیکھ کر ایسے شرمانے لگی جیسے ایک دلہن۔ اچانک اس کے کانوں میں شہنائیاں بجنے لگیں۔ اس کے بند
پلکوں کے سامنے سفید گھوڑی پر سوار ہو کر وہی پریوں کا راجہ اُسے دیکھ دیکھ کر مُسکرا رہا تھا۔ بالکل ویسے ہی
جیسے اس کی ماں اسے بچپن میں کہانیاں سنایا کرتی تھی۔ کانپتی ہوئی انگلیوں سے پردے کو ہٹاتے ہوئے
وہ چور نگاہوں سے دور دور تک پھیلی ہوئی ایک جھیل کو دیکھنے لگی۔ چھوٹی چھوٹی چمکتی ہوئی لہروں کو دیکھ کر اس
کا دل مچلنے لگا۔ پانی کی سطح کو چومتی ہوئی کناروں پر پھولوں کی قطاروں کو دیکھ کر اس کی سانسیں تیز ہونے
لگیں۔ صاف اور شفاف پانی میں کسی عریاں اپسرا کو غوطے لگاتے دیکھ کر اس کا دل ٹوٹنے لگا۔ اچانک
اس کی نظریں یونانی دیوتاؤں جیسے ایک شخص پر رک گئیں۔ وہ ایک کشتی چلا رہا تھا۔ اور کشتی کا رخ اسی طرف
تھا۔ جہاں وہ عورت نہا رہی تھی۔ اس کی سانسیں اور بھی تیز ہونے لگیں۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا
چہرہ چھپائے شرماتے ہوئے سوچتی رہی۔ آخر احساسات و جذبات کا گنجینہ لے کر پیار و محبت کی باتیں۔ راز و
نیاز کی باتیں، زندگی و زندہ دلی کی باتیں، کہاں سے شروع اور کہاں ختم۔ اگلے ہی لمحے چپلوں کی آواز قدموں
کی آہٹ اور پردے کی جنبش کے ساتھ ایک جانی پہچانی آواز سنتے ہی وہ چونک پڑی۔ سانسوں کی رفتار
بے قابو ہو گئی اس کا سارا بدن کانپنے لگا، لب تھرتھرانے لگے اور وہ پردہ ہٹاتے ہی پروفیسر آنند ورما کے
بدن کے ساتھ ایسے لپٹ گئی جیسے دو بچھڑے دل ایک مدت کے بعد ملے ہوں۔ کسی کی گرم گرم سانسوں
کو اتنا قریب سے محسوس کرتے ہوئے چالیس سال کی عمر میں آج پہلی بار اسے شدت سے ایک عورت ہونے
کا احساس ہوا ۔ جیسے وہ ایک انجانی آگ کی گرمی سے موم کی طرح پگھل کر آنند کے قدموں پر گر رہی تھی
اور شاید پروفیسر آنند اس کی کیفیت بھانپ گیا تھا۔

سگریٹ کے ہلکے ہلکے کش لگاتے ہوئے کافی کی گرم گرم چسکیاں لیتے ہوئے وہ پُرمعنی نظروں سے اس کے بدلے تیور اور بدلے لباس کو دیکھتا رہا۔ اس کے عجیب اندازِ بیان کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ جب کہ وہ اپنی ہر ادا سے اسے اپنے دل کا زخم دکھاتی رہی۔ آنکھوں آنکھوں سے دل کا درد بتاتی رہی اور گوشوں میں اپنا حالِ دل سناتی رہی۔ "چنچل تمہیں یہ اکیلا پن ڈس رہا ہے۔ سادھو سنتوں کی ٹولی سے فرار ہو کر شادی کر لو۔" پروفیسر آنند نے ایک لمحے کی خاموشی کو توڑ کر کہا۔ شادی کا نام سنتے ہی وہ خوشی سے چیخ پڑی۔ اُسے ایسے محسوس ہوا جیسے بینا کے تار خود بخود بج رہے ہوں۔ سوہنی اور مہیوال بیجان کینواس چھوڑ کر اس کے ساتھ ناچنے لگے ہوں۔ فضا میں پھلجھڑیاں چھوٹنے لگی ہوں اور بینڈ باجے کے ساتھ ہی پریوں کا راجہ بارات لے کر آ رہا ہو ـــــ لیکن اچانک ایک دھماکہ ہوا اور زلزلے سے ایک حسین عمارت کھنڈر میں تبدیل ہو گئی۔ تار ٹوٹ گئے، ساز خاموش ہو گئے اور زور کی آندھی کے ساتھ وہ ایک تنکے کی طرح اپنے وجود کو نوچنے لگی اور چہرے کو اپنے ہی ناخنوں سے بے دردی سے کھرچنے لگی۔ پروفیسر آنند کب اور کس وقت چلا گیا تھا وہ نہیں جانتی۔ کرب و اضطراب میں ہر لمحہ گزارتے ہوئے آج پھر سلگتی رات کی تنہائی اسے پھن پھیلائے ناگ کی طرح بار بار ڈستی جا رہی ہے اور وہ دہکتے ہوئے انگاروں پر رکھے ایک نازک پھول کی طرح جھلس رہی ہے۔ دوسرے دن معمول کی طرح کھادی کے کفن کے نیچے اپنے وجود کو دفن کر کے آنکھوں پر موٹی موٹی عینکیں چڑھائے اور ہاتھ میں وہی وزنی کتابیں لیے کلاس روم سے نکلتے ہوئے جب پروفیسر آنند نے اسے معمول کی طرح "چنچل" کے نام سے پکارا تو اس کے قدم رک گئے۔ اس کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی اور وہ آہ بھر کر آہستہ سے کہنے لگیں۔

"پروفیسر آنند! آپ یونیورسٹی میں نئے نئے آئے ہیں اس لیے شاید آپ یہ نہیں جانتے کہ یہاں کا ہر طالب علم، پروفیسر، کلرک، چپراسی، ڈرائیور ہی کیا شہر کا بچہ بچہ مجھے جوگن کہتا ہے۔ آپ بھی آئندہ ـــ"

اس کی آواز ٹوٹ گئی۔ آنسو کو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے جب اس نے ٹائیلٹ کا دروازہ بند کیا تو سامنے لگے ہوئے ایک چھوٹے سے آئینے میں اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں اپنا سیاہ رنگ، چہرے پر چیچک کے داغ، موٹی بھدی ناک، پژمردہ پچکے گال، حبشیوں جیسے بے ترتیب بال دیکھ کر وہ چیخ پڑی۔

●●
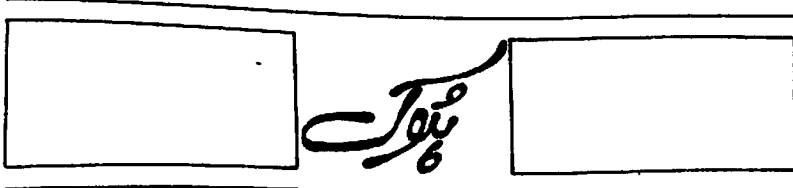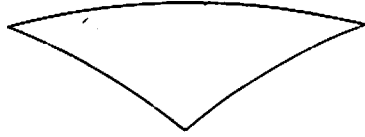
دینوشاہ کے ہونٹ تھرتھرانے لگے، اس نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اندر والی جیب میں سے ایک لفافہ نکال کر بغیر پڑھے ایسے پھاڑ دیا جیسے وہ لفافہ نہیں بلکہ اپنا ہی گریبان چاک کر رہا ہو، یہ لفافہ ہر وقت اس کی جیب میں پڑا رہتا تھا۔ موقع پاتے ہی وہ دن میں کئی بار نکال کر اس میں رکھے ہوئے خط کو ایسے پڑھتا رہتا تھا جیسے وہ خط کو پہلی بار پڑھ رہا ہو اور پھر ہر بار وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب کر خلاؤں میں گھورنا شروع کرتا تھا۔ گویا وہ لفافہ کوئی معمّہ تھا اور جس کے لیے اسے کسی واحد حل کی تلاش تھی۔ ذرا سی آہٹ پاکر یا کسی جھانکتی ہوئی نگاہ کو دیکھ کر وہ جلدی سے لفافہ بند کر کے اسے جیب میں یا سرہانے کے نیچے یوں چھپا دیتا جیسے اپنا کوئی گناہ چھپانے کی کوشش کر رہا ہو اور اگلے ہی لمحے وہ حقے کے ہلکے ہلکے کش لگا کر اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کو سرچ لائٹ کی طرح دائیں بائیں گھما کر اپنے مکان میں رہنے والے کرایہ داروں کو ایسے دیکھنا شروع کرتا تھا جیسے کوئی جاسوس کسی اونچی جگہ بیٹھ کر دشمن کی نقل و حرکت پر نظر رکھے ہوئے ہو۔

ایک مدّت کے بعد آج اس نے اس لفافہ کو پھاڑ کر پھینک دیا اور پھر کاغذ کے بکھرے ہوئے تنکوں کو اس طرح دیکھنے لگا جیسے وہی تنکے اس معمّہ کا واحد حل تھا جس کی اسے پچھلے بیس سال سے تلاش تھی۔

دینوشاہ کا شمار شہر کے امیر ترین لوگوں میں ہے۔ اس کا اکلوتا بیٹا امریکہ میں ایک امریکن لڑکی سے شادی کر کے ایک عرصہ سے وہیں مقیم ہے۔ اس کی اکلوتی بیٹی بھی ماں کی موت کے بعد بچپن میں اپنے بھائی کے ساتھ گئی تھی اور جوانی میں قدم رکھتے ہی وہ واپس لوٹ آئی تھی لیکن صرف موت کے آغوش میں پناہ لے کر چھپ جانے کے لیے۔ اس لیے اب وہ تنہا ہی تھا۔

اپنے حویلی نما مکان میں اگر اسے کوئی تکلیف تھی تو وہ فقط اکیلے پن کی ۔ لیکن اس اکیلے پن کا علاج اس نے ڈھونڈ لیا تھا ۔ اس نے ایک دو کمرے اپنے استعمال کے لیے رکھ چھوڑے تھے اور باقی تمام کمرے مختلف قسم کے لوگوں کو کرایہ پر اس لیے دے رکھے تھے تاکہ آس پاس چہل پہل رہے گویا مکان میں کالج کے لڑکے، بوڑھے، بچے بھی رہتے ہیں لیکن جب اس کے آس پاس نوجوان عورتیں یا کمسن لڑکیاں ہوتی تھیں تو اسے اپنے اکیلے پن کا احساس بالکل ختم ہو جاتا تھا ۔

دینوشاہ کی رنگیں مزاجی سے سارا شہر بخوبی واقف تھا اس کی جوانی میں خاص طور پر بیوی کے مرنے کے بعد اس کے معاشقوں کے قصّے کافی مشہور تھے ۔ وہ خود بھی کبھی کبھی اپنی جوانی کی حکایتیں بڑے مزے سے سنایا کرتا تھا اور یہ قصے مکان میں رہنے والوں کے ساتھ ساتھ محلے والوں کی بھی تفریح کا سامان بن گئے تھے ۔

بال سفید ہوتے ہی اس کے فطری تقاضے عمر کے بوجھ تلے دب تو چکے تھے لیکن جب بھی کوئی نوجوان لڑکی یا عورت اس کے سامنے سے گزر جاتی تھی تو وہ اُسے گھور گھور کر ابھی بھی بڑے اشتیاق سے دیکھتا تھا ۔ اس کی یہ حرکتیں بھی دیکھنے والوں کو اشتعال دلانے کی بجائے تفریح کے مواقع فراہم کرتی تھیں شرارتی قسم کی لڑکیاں جب جان بوجھ کر اُسے چڑانے کے لیے اس کے سامنے بیٹھ کر خوش گپیوں میں مصروف ہو جاتی تھیں تب وہ اپنی خوبصورتی سے تراش کی ہوئی سفید مونچھوں کو اپنی کمزور انگلیوں سے سنوار تکیہ بغل میں دبوچ کر انہیں ایسے دیکھتا رہتا تھا جیسے کوئی نواب اپنے حرم میں کوئی دلکش رقص دیکھ رہا ہو ۔ کبھی کبھار جب وہ اپنے ارد گرد لوگوں کی کیفیت بھانپ لیتا تو وہ چارپائی سے اتر کر فرش پر ایسے ٹہلنے لگتا جیسے کوئی شہنشاہ ہاتھی سے اتر کر گھوڑے پر سوار ہو کر دشمن کا مقابلہ کرنے لگا ہو ۔ یہ بھی ایک تفریح کا سامان ہوتا تھا ۔

بوڑھے شیر کی طرح جب وہ گرجنے لگتا تو اس کی زبان اس کے مسوڑوں سے پھسل کر ایسے باہر آنے لگتی جیسے کوئی سانپ سپیرے کی پٹاری سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہا ہو ۔ یہ اس کے غصے کا مظاہرہ ہوا کرتا تھا لیکن مکان میں رہنے والے کالج کے لڑکے لڑکیاں صرف اسے چڑھانے کی غرض سے اُسے سناتے ہوئے ایک دوسرے سے مخاطب ہو کر کہنا شروع کرتے، سُنا ہے امریکہ میں سو سال کے ـــ بوڑھوں کو بھی شادی کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی پچاس سالہ میم مل جاتی ہے ۔ لیکن یہاں کے بوڑھوں

تو تیس سال کی دلہن بھی مل جاتی ہے۔" کہو کالیں پھر مہورت!"

یہ معنی خیز مکالمے سن کر ستر سالہ دینوشاہ ان کو کبھی مکان سے باہر نکلنے کی دھمکی دیتا تھا اور کبھی ان کے اس مذاق سے لطف اندوز ہو کر مکان یا کمروں کی مرمت وغیرہ کا کام فوراً کروا دیتا تھا۔ کبھی کبھی تو وہ ان کے بچوں کو مٹھائی کے لیے موٹی موٹی رقم بھی دیتا تھا۔ اس کے کرایہ دار کسی بھی بات کا کبھی برا نہیں مانتے تھے۔ لیکن جب سے دینوشاہ نے اپنا ایک کمرہ گوبند کو کرایہ پر دے دیا تو گویا ساری عمارت میں زلزلہ آگیا۔

گوبند کمرے میں اکیلا نہیں رہتا تھا اس کے ساتھ اس کے بچے بھی تھے اور خوبصورت بیوی بملا بھی۔ ان کے بارے میں کرایہ دار ہی نہیں بلکہ محلے کے تقریباً سب ہی لوگ چہ میگوئیاں کرنے لگے تھے۔ اور دینوشاہ کو مشکوک نظروں سے دیکھنے لگے تھے۔ حالانکہ مکان میں اور بھی حسین عورتیں رہتی تھیں لیکن بملا کی طرف بڑھتی ہوئی دینوشاہ کی توجہ زیادہ دیر چھپ نہیں سکی تھی۔

شکل وصورت سے بملا بھولی بھالی تھی۔ محلے کے کئی گھروں میں جا کر وہ برتن صاف کرتی تھی۔ کپڑے دھوتی تھی اور گھریلو قسم کے اور بھی چھوٹے چھوٹے کام کرتی رہتی تھی مگر جب سے وہ دینوشاہ کے مکان میں رہنے لگی تھی دینوشاہ نے اپنے بوڑھے نوکر کو نکال دیا تھا اور بملا ہی دینوشاہ کے سارے کام کرتی تھی۔ ایک بار کمرے میں داخل ہو کر وہ دن ڈھلنے تک وہاں سے نکلتی نہیں تھی۔ گوبند خود دن بھر مچھلیاں پکڑتا رہتا اور شام کو ریڑھی لگا کر تلی ہوئی مچھلیاں بیچتا رہتا تھا اور گئی رات گھر لوٹتا تھا۔ بچے دن بھر اسکول میں رہتے تھے اور گھر میں ان کی بڑی لڑکی رادھا رہتی تھی۔ وہ بھی صحن میں میز لگا کر محلے والوں کے دُھلے ہوئے کپڑوں پر استری کرتی رہتی تھی۔ یوں بملا کو تقریباً سارا دن دینوشاہ کے کمرے میں گزارنے کا موقع مل جاتا تھا۔ یہ حقیقت تمام کرایہ دار بخوبی جانتے تھے بملا کی عمر یوں تو تیس سال سے زیادہ نہیں لیکن گاؤں کی اس صحت مند عورت کا چہرہ و جسم بناوٹ سے ہی پُرکشش ہے۔ اس کے سادہ بدن سے جھانکتے ہوئے نسوانی وقار میں کسی قسم کی کمی نہیں۔ اس لیے لوگ طرح طرح کی باتیں کرنے لگے تھے۔ دینوشاہ کی مرحوم بیوی کے چند پرانے کپڑے پہن کر بملا کا روپ اور بھی نکھر آیا تھا اور اس تبدیلی کے ساتھ لوگ مشکوک نظروں سے بملا اور دینوشاہ کے ساتھ ساتھ گوبند کو بھی دیکھنے لگے تھے کیونکہ وہ ہر رات کوئی نہ کوئی ہنگامہ برپا کر دیتا تھا اور اس سے سارے محلے میں تشویش پھیل گئی تھی۔

ہر رات گوبند کی کھردری آواز اور گالی گلوچ محلے والوں کو بیدار کرتی تھی اور پھر بملا کی چیخ و پکار بچوں کی

آہ و بکا کے ساتھ دینو شاہ کی ٹوکا ٹوکی محلے والوں کی نیند حرام کرنے لگی تھی۔ پہلے پہل تو مکان میں رہنے والے دوسرے کرایہ دار یا گاہے بگاہے محلے والے بھی بیچ بچاؤ کے لیے دوڑ پڑے تھے لیکن بعد میں دینو شاہ کی ضد کی وجہ سے یہ ناگوار شور غل برداشت کرنے کے ویسے ہی عادی ہو گئے جیسے کسی بڑے ریلوے اسٹیشن کے پڑوس میں رہنے والے لوگ رات کی خاموشی کو چیرتی ہوئی ریل کے انجن کی چیخ اور لگاتار پہیوں کی گڑگڑاہٹ کے عادی ہو جاتے ہیں۔

گوبند کے تین چھوٹے چھوٹے لڑکے یوں تو ان ہنگاموں کے عادی ہو چکے تھے پھر بھی کبھی کبھار جب گہری نیند سے بیدار ہو کر اپنی اشک بار آنکھوں کو موند کر رونا شروع کرتے تو گوبند اور بملا ان کی معصومیت کو نظر انداز کر کے ایک دوسرے پر وار کرتے رہتے تھے جیسے ایک سانپ اور ایک نیولا لڑ رہے ہوں۔

تین چار جھڑپوں کے بعد گوبند گالیاں بکتا ہوا تقریباً روز ہی برآمدے میں جا کر چارپائی بچھا کے کروٹیں بدلنا شروع کرتا تھا اور بملا رات بھر سسکتی رہتی تھی بچے تو خیر نا سمجھ تھے۔ فوراً جنگ بندی ہوتے ہی آرام سے سو جاتے تھے لیکن پندرہ سالہ رادھا اپنے ماں باپ کی تکرار کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کرتی رہتی تھی۔ اور رات دن سوچ میں ڈوبی رہتی تھی۔

صبح ہوتے ہی گھر میں مکمل خاموشی چھا جاتی تھی اور پھر یہ تبدیلی دیکھ کر محلے والے حیران تھے۔

گوبند کو تو ویسے بھی محلے میں کوئی پسند نہیں کرتا تھا۔ ایک تو وہ بدصورت تھا اور پھر بدماغ بھی۔ اس کے روز روز نے سے وہ اور بھی تنگ آ چکے تھے۔ اس لیے گوبند کو محلے سے نکلوانے کے لیے انہوں نے کتنے ہی جتن کیے لیکن دینو شاہ کسی بھی قیمت پر گوبند کو اپنے مکان سے نکالنے کے حق میں نہ تھا۔ حالانکہ سبھی جانتے تھے کہ دینو شاہ اس قسم کے ہنگامے تو کیا کبھی کبھی بچوں کی چیخ و پکار بھی پسند نہیں کرتا تھا۔

دینو شاہ کو شروع سے ہی گوبند سے نفرت تھی لیکن وہ سب فقط بملا کے لیے برداشت کر رہا تھا۔ کمرے کا کرایہ نہیں بجلی فیس نہیں، یہ تمام سہولتیں دینو شاہ گوبند کو نہیں بلکہ بملا کو دیتا تھا سردیوں کی صبح جب بملا دینو شاہ کے اشارے کے ساتھ ہی ایک پالتو بلی کی طرح اس کے کمرے میں داخل ہوئی تو چند پڑوسیوں کا شک یقین میں بدل گیا اور وہ چشم دید گواہ بن کر اس بات کی تصدیق کرنے پر آمادہ

ہو گئے تھے کہ دینو شاہ نے بملا کو اپنی کھیل بنا کر رکھا ہوا ہے لیکن ہنگامہ صرف رات کو ہوتا ہے دن کو نہیں
یہ بات کسی کے سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

ان ہی دنوں گوبند کی لڑکی رادھا نے ایک روز جب اپنی ماں کو دینو شاہ کے کمرے میں گھس کر اندر سے دروازہ بند کرتے دیکھا تو وہ بھی بند دروازے سے چپک کر دونوں کی گفتگو سننے لگی۔ ایک ایک لفظ اس کے نابالغ ذہن کو چونکا تا رہا اور اس کے سانسوں کی رفتار تیز ہو گئی تھی۔ کم عمری اور ناسمجھی کی وجہ سے وہ الفاظ کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کرتی رہی۔ گویا وہ ماں کی زبان سے نکلے ہوئے ہر لفظ کو یوں کرید تی رہی جیسے کسی پتھر سے ریت کے ذرے اور پھر رات ہوتے ہی سر درد کا بہانہ بنا کر گوبند کی آمد سے پہلے ہی برآمدے میں چارپائی بچھا کر سو گئی۔ اس رات کوئی ہنگامہ نہیں ہوا۔

اس غیر متوقع مگر خوشگوار تبدیلی نے سارے محلے والوں کو چونکا دیا پھر جب دوسری رات بھی خاموشی سے گزر گئی تو لوگوں نے یہی اندازہ لگایا کہ دینو شاہ نے گوبند کا منہ سکوں سے بند کر دیا اس کے بعد تاریک راتیں خاموشی سے گزرتی گئیں اور رفتہ رفتہ لوگ بھول ہی گئے کہ گوبند اور بملا کا کبھی جھگڑا ہوا کرتا تھا۔ تقریباً چار مہینے کے بعد سارے محلے میں ایک بار پھر تشویش پھیل گئی تھی۔

محلے والے ایک ایک کر کے پولیس اسٹیشن کے احاطے میں جمع ہو رہے تھے اور جب دینو شاہ کو پولیس نے طلب کیا تو اس پر واقعات کی تفصیل سنتے ہی بجلی گر پڑی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور وہ جب منہ لٹکائے ایس۔ ایچ۔ او صاحب کے کمرے میں داخل ہوا تب بملا کا بیان قلمبند ہو رہا تھا۔

بملا کا ہر لفظ سسکیوں و ہچکیوں میں ڈوبا جا رہا تھا اور اس کے بیان کا ایک ایک لفظ جہاں گوبند پر آگ برسائے جا رہا تھا وہاں دینو شاہ کو بھی برقی جھٹکوں کی مانند ہلا رہا تھا۔ گوبند، بملا اور دینو شاہ تینوں ایسے تڑپ رہے تھے جیسے وہ دلدل میں دھنسے جا رہے تھے۔ جب کہ رادھا کمرے کے ایک کونے میں ایک سوالیہ نشان کی طرح کھڑی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر آس پاس کھڑے لوگوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے کپڑے گیلے تھے اور اس کے جسم کے ساتھ چپک گئے تھے۔ بکھرے بالوں سے پانی کے قطرے ٹپ ٹپ کر یوں گر رہے تھے جیسے وہ اس کے حال پر ایک ہمدرد چشم دید گواہ کی طرح حالات کی ستم ظریفی پر آنسو بہائے جا رہے تھے۔ آس پاس کھڑے لوگ اسے یوں دیکھ رہے تھے جیسے نمائش گاہ میں رکھا ہوا عجوبہ دیکھ رہے ہوں۔

"یہ سب کیا ہے؟" دینو شاہ کی ٹوٹی آواز نے سب کو چونکا دیا۔ایک وقفے کے لیے حاضرین اس کے چہرے کو دیکھتے رہے اور خاموشی چھا گئی۔جو لوگ کچھ بھی چاہتے تھے وہ بھی مشکوک نظروں سے دینو شاہ کو دیکھنے لگے۔

"رادھا کو پولیس نے آج صبح گرفتار کیا ہے شاہ جی!"

ایس، ایچ، او صاحب نے قلم میز پر رکھ کر کہا "رادھا خودکشی کرنا چاہتی تھی اور اس نے اقبال جرم کے ساتھ یہ بھی کہا ہے کہ وہ ماں بننے والی ہے۔کنواری ماں!! اس غفلت کے ذمہ دار اس کے والدین ہیں شاہ جی! انہوں نے چند رنگین راتیں بسر کرنے کی خاطر راستے کا کانٹا تو صاف کر دیا تھا لیکن یہ نہیں سوچا تھا کہ ایک کم سن معصوم ۱۵ سالہ لڑکی سرد راتوں میں برآمدے میں تنہا سو کر کسی بھی جنس زدہ وحشی کی ہوس کا شکار ہو سکتی ہے۔رادھا اپنے ماں باپ کی خاطر قربان ہو گئی۔اور اگر وہ ایسا نہ کرتی تو ماں باپ کے جھگڑے کبھی ختم نہیں ہو پاتے"۔ایس، ایچ، او نے جب اپنی مختصر تقریر ختم کر دی تو گوبند کو ایسا لگا جیسے وہ ایک اونچی چوٹی سے گر کر نوکیلے پتھروں سے ٹکراتا ہوا ایک کھائی کی گہرائی میں ڈوبا جا رہا ہو۔

محلے والے کہانی کی تہہ تک پہنچ گئے تھے اور وہ دینو شاہ کو مشکوک و نفرت بھری نگاہوں سے گھور رہے تھے۔

"درندہ" کسی نے زیر لب کہا اور یہ لفظ سنتے ہی دینو شاہ چیخ پڑا اور زار زار رو کر فرش پر بکھرے کاغذ کے ٹکڑوں کو دیکھتا رہا جو ہوا کے جھونکوں سے اڑنے لگے تھے۔

لوگوں کی مشکوک نظریں جب سوالیہ نشان بن گئیں تب دینو شاہ اپنی توتلی زبان میں کہنے لگا۔

"ہاں ہاں۔درندہ! آج بیس سال کے بعد میں اپنی مرحومہ بیٹی کی تحریر سمجھ سکا۔اس نے بھی یہی لفظ استعمال کیا تھا۔وہ تو بھابی کی غفلت یا بھائی کی لاپرواہی ہو سکتی تھی لیکن بھلا تو ماں ہے۔پھر یہ سب کیوں ہوا؟ کیسے ہوا؟ میرا بیٹا بھی رنگین راتوں کا سحر دیکھتے دیکھتے اپنی بن ماں کی بہن کو بھول گیا تھا اور وہ یوں پڑی رہی جیسے درندوں کے سامنے شکار۔اس کم بخت حبشی نوکر نے بھی میری معصوم بیٹی کو ایسے ہی۔" اپنا جملہ مکمل کرنے سے پہلے ہی اس کی زبان رک گئی اور وہ رادھا کو دیکھنے لگا اس کے دل سے ایک ہوک اٹھی اور یوں لگا جیسے اس کی بیٹی کی تحریر ایک تصویر بن کر اسے گھور گھور کر دیکھتے ہوئے وہی الفاظ دہرانے لگی ہو۔حبشی نوکر

درندہ ہے۔ اسے کچل ڈالو یا پکڑ لو۔ اس معنی خیز جملے کا مطلب وہ بیس سال کے بعد سمجھ گیا تھا اور وہ اپنے تھرتھراتے ہونٹوں پر مشکل سے قابو پاکر تسلیاں دینے لگا۔

جب میری آنکھوں میں تیز بینائی تھی تب چمک دمک نے یوں گھیر لیا تھا کہ کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اب جب کہ میری بینائی کمزور ہے مجھے سب کچھ نظر آنے لگا ہے میں حبشی کو نہ تو پکڑ سکا اور نہ ہی اسے کچل سکا۔ لیکن اس شخص کو ضرور تلاش کروں گا جو رادھا کو مسل کر بھاگ گیا ہے۔ یہ کہتے ہی دینوشاہ غصے سے لال ہو گیا۔

بملا نے آنسو پونچھ لیے اور رادھا کو گلے سے لگا کر ملتجی نظروں سے دینوشاہ کو دیکھتی رہی۔

دینوشاہ اس کا حقیقی باپ نہ سہی لیکن باپ جیسا سلوک ضرور کرتا تھا۔ اور اسے اکثر اپنی مرحومہ بیٹی کے نام سے پکار کر اپنے کلیجے کی آگ کو ٹھنڈا کیا کرتا تھا۔
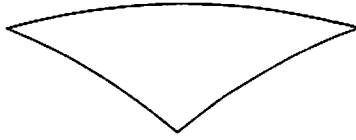
ابھی بہت سویرا ہے۔ کھڑکی ادھ کھلی ہے اور میں بستر پر نیم دراز سگریٹ کے ہلکے ہلکے کش لیتے ہوئے کبھی کونے میں رکھے سنگِ مرمر کے خوبصورت مجسمے کو دیکھتا ہوں اور کبھی آتش دان سے اٹھتی ہوئے دھوئیں کی لکیروں کو ـــ باہر برف گر رہی ہے۔ ہلکی ہلکی، خاموش خاموش، گویا کوئی دل شکستہ چپکے چپکے آنسو بہا رہی ہو۔ آس پاس برف ہی برف ہے اور برف کی چادر پر چند قدموں کے نشان ہیں اور میں ابھی ابھی گھر لوٹا ہوں۔ تھکا ہارا! سردی سے ٹھٹھرتا! میرے دانت بج رہے ہیں اور میں ٹھٹھرتے ہاتھوں سے آتش دان کی ادھ جلی لکڑی ہلاتا ہوں۔ آگ بھڑک اٹھتی ہے اور راکھ کے نیچے چھپے ہوئے کتنے ہی انگارے گزرے حادثوں کی طرح ٹکٹکی لگائے مجھے دیکھ رہے ہیں چنگاریاں شعلے بن کر میرے احساسات وجذبات چھونے لگی ہیں اور مجھے بیتی باتیں یاد آ رہی ہیں۔

اس روز بھی ایسے ہی برف گر رہی تھی۔ گلمرگ کے ہائی لینڈ ہوٹل کے نرالے بار روم میں ایک پرکشش شام تھی ہر ہاتھ میں جام تھا۔ ساز بج رہا تھا اور رما میری من پسند غزل "ذکر اس پری وش کا ....." گا رہی تھی۔ اس کی آواز میں سوز تھا، بیان میں لطافت، آنکھوں میں نشہ تھا اور اداؤں میں نزاکت! پریوں کی طرح مسکراتی رما کو دیکھتے ہی جب میرے تصور کے دھندلے دھندلے خاکے جیتے جاگتے خدوخال میں بدل گئے تو میرا بجھا بجھا دل ساز اور آواز سے ہم آہنگ ہو کر دھڑکنے لگا تھا، ارمان مچلنے لگے تھے اور زندگی کتنی حسین نظر آتی تھی۔ گلابی رنگ کی شال میں لپٹے ہوئے اس کے بدن کی قربت کا احساس ایسا تھا جیسے ایک ٹھٹھرتی ہوئی رات میں آگ کی سہانی آنچ حسن کی دیوی اور نسوانی وقار کے اس مجسمے کی بناوٹ میں قدرت نے کتنی فنکاری سے کام لیا ہوگا، یہ میں آج بھی سوچ رہا ہوں۔ رما کتنی حسین ہے، کتنی پرکشش، لگتا ہے جیسے قلوپطرہ نے صدیوں بعد مصر کے صحراؤں کو چھوڑ کر برف کی ان وادیوں میں جنم لیا ہو۔ پہلی بار جب میں

نے اس نیلی نیلی جھیل سی گہری آنکھوں میں دیکھا تھا تو زندگی صبح کی کرن کی طرح مجھ سے آنکھ مچولی کھیلنے لگی تھی۔ دوسری بار میرے کمرے میں مدھم روشنی تھی اور رما کے قدموں کی آہٹ میرے دل کے ہر گوشے میں گدگدی کرنے لگی تھی۔ تیسری بار اس کی پائل کی جھنکار سے میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئی تھیں اور اس سے لپٹ کر ایسا لگا تھا جیسے کسی صحرا میں مدتوں بعد دو بچھڑے ہوؤں کا ملاپ ہو رہا ہو۔ پھر رفتہ رفتہ رما میرے دل میں تمنا کے ایک غنچے کی طرح آہستہ آہستہ کھلتی رہی اور میری بیوی للیتا خزاں آلودہ پتّے کی طرح میری زندگی سے الگ ہوتی گئی۔ لیکن محبت کا وہی پھول دیکھتے ہی دیکھتے دہکتے ہوئے انگاروں پر رکھے ایک نازک پھول کی طرح جھلس کر راکھ ہوتا رہا ہے اور ہوا کا ہر جھونکا راکھ کی تہ کو مجھ سے الگ کر کے نہ جانے کہاں لے جاتا رہا۔

رما میری داشتہ نہیں ہے۔ ملک کی یہ نامور رقاصہ میری بیوی ہے۔ لیکن اس کے چاہنے والوں کی تعداد اتنی ہی ہے جتنی چاند کے گرد ستاروں کی۔ اس کے پاس عزّت ہے۔ دولت ہے، شہرت ہے لیکن نہ چاہت کا جذبہ ہے اور نہ ہی شادی کا بندھن! وہ اکثر گھر سے تو کیا شہر سے باہر رہتی ہے کبھی کبھی ملک سے بھی باہر رہتی ہے اور میں اس محل نما مکان کی چار دیواری میں ماضی کا صدمہ لیے اپنے مستقبل کا ماتم کرتا رہتا ہوں۔ سگریٹ کا زہریلا دھواں پھونک پھونک کر دن کاٹتا ہوں اور شراب کے تلخ گھونٹ پی پی کر راتیں گزارتا ہوں۔

سکون کی تلاش میں ہوش و حواس قائم رکھنے کے لیے نازیبا حرکتیں کرتا ہوں لیکن پھر بھی نہ چین ہے اور نہ قرار۔ فقط جذبات کی شدت، احساسات کی گھٹن ہے اور خیالات کی کشمکش ہے۔

رما پورے تین مہینے کے بعد گھر لوٹی تو ہے لیکن وہ کل بھی رات گئے یہاں آئی ہے اور اس وقت میرے اتنے قریب ہوتے ہوئے بھی مجھ سے دور ہے۔ نہ رشتہ ہے اور نہ بندھن ہے۔ فقط ہمارے درمیان ایک دراڑ ہے جو رفتہ رفتہ ایک کھائی بنتی جا رہی ہے۔ تبھی تو میں نے آج بھی آدھی رات سگریٹ کی راکھ جھاڑتے، چٹکیاں بجاتے گزاری ہے اور باقی آدھی رات پہاڑی کے دامن میں برف کی تہیں اٹھاتے ہوئے۔ دیواروں پر آویزاں تصویروں کو توڑا۔ ادھ جلی لکڑی سے آس پاس کی ہر خوبصورت چیز کو مسمار کر دیا۔ لیکن پھر بھی رما نے یہ شیشوں کے ٹوٹنے کی آواز سنی اور نہ ہی میرے لوٹے دل سے نکلی کراہوں کو۔ بس بستر پر ایسے لیٹی رہی گویا ایک ناگن ڈسنے کے بعد الٹ گئی ہو۔

وہ کس کے ساتھ آئی۔کہاں سے آئی۔ وہاں محفلِ موسیقی تھی، محفلِ یاراں تھی، مے کشی تھی یا دل لگی تھی۔ یہ میں روز ہی پوچھنا چاہتا تو ہوں لیکن سوچتا ہوں کہ حال پوچھوں یا حالت دیکھوں۔ وہی لڑکھڑاتے قدم، سہارے کا محتاج نیم عریاں بدن اور ایک کچلے ہوئے پھول کے مانند چہرہ۔ بے دردی سے دبوچا ہوا جسم، جس کو جب بھی چھو لیتا ہوں۔ تو وہ ایسے چلاتی ہے جیسے میں نے کسی پھوڑے کو نوکیلے نیزے سے چھیڑا ہو۔

کل میں بھی رات گئے گھر لوٹا۔ دن بھر بس چلتا ہی رہا۔ کبھی اس پہاڑی پر اور کبھی اس پہاڑی پر ٹکوپروں کو اڑاتا پھرا۔ یہ میرا مشغلہ نہیں ہے بلکہ دن کاٹنے کا ایک بہانہ ہے۔ نہیں تو دن کٹے بھی کیسے۔ ؟ یوں بھی دن میں چھ سات دفعہ نہاتا ہوں۔ نو دس بار کپڑے بدلتا ہوں۔

کبھی برف کے بت بناتا ہوں اور کبھی خود ہی بت کی طرح برف کے ڈھیر کو دیکھتا ہوں۔ برف سے ڈھکے مکان، درخت اور پہاڑیاں دیکھتا رہتا ہوں یا پھر برف کی تہیں اٹھاتا رہتا ہوں۔ کل بھی میں کوئی ایسی ہی احمقانہ حرکت کر رہا تھا کہ کسی کی سرگوشیوں نے مجھے چونکا دیا۔ پیچھے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اور سفید لباس پہنے ایک عورت سامنے سے گزر گئی۔ صورت جانی پہچانی تھی لیکن للیتا چھ مہینے کے بعد کیا لوٹ کر آسکتی ہے؟

وہ تو گونگی تھی، بہری تھی، بدذوق تھی۔ پھر یہ ہلکے ہلکے سُروں میں کون گنگنا رہا ہے۔ شاید رما میری تلاش میں بھٹک رہی ہوگی۔ برف کی تہیں ہٹاتے میں یہی سوچ رہا تھا کہ کسی نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے فوراً بندوق کا گھوڑا دبایا اور اس غریب کو ابدی نیند سلا دیا۔ سفید سفید برف کی چادر پہ سرخ لہو کے داغ دیکھتے ہی میرے احساسات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ گویا میرے سامنے خون میں لت پت ایک لاش کو ڈھانپتی ہوئی ایک سفید چادر تھی۔ اور چادر کے نیچے ایک جانا پہچانا چہرہ تھا۔ میرے ہاتھ سے بندوق گر گئی۔ دل سے ایک ہوک اٹھی اور میں اپنی وحشیانہ حرکت پر نادم ہوا۔ میری نظریں جب کتیا کے پھٹے ہوئے پیٹ پر رک گئیں تو میں چیخ پڑا۔ وہ ماں بننے والی تھی۔ للیتا بھی ماں بننے والی تھی! — اور میں باپ!! برف سے ڈھکی ہوئی ایک درخت کی ٹہنی جب ٹوٹ کر گر گئی تو مجھے ایسا لگا جیسے ایک باپ اپنے بچے کے کفن کو چوم کر چیخ پڑا ہو۔ میں بھی چیخ پڑا۔ راہ گیر مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھتے رہے۔ نوکر لوگ دوڑتے بھاگتے میرے پاس آگئے لیکن میں بھاگتا رہا، چیختا رہا، چلاتا رہا، کانپتے ہوئے، ہانپتے ہوئے پہاڑی کے دامن میں برف کی تہیں اٹھاتا

رہا لیکن وہاں نہ ماں ملی اور نہ اس کا پچہ، نہ بیوی ملی اور نہ ہی بیٹی، نہ دوست ملی اور نہ ہی محبوبہ وہاں فقط برف تھی۔

پھر جب گھر پہنچا تو وہاں فقط نوکر تھے اور میرے کمرے میں سنگ مرمر کا ایک بت تھا جیختا چلاتا، دوڑتا بھاگتا میں گھر گھر رما کی تلاش کرتا رہا کبھی ٹی وی سینٹر کبھی ریڈیو اسٹیشن کبھی رقاص گوپی کرشن کے گھر کبھی کیپٹن کول کے گھر کبھی استاد شاکر خاں کے گھر۔ لیکن رما کہیں نہ ملی۔ پھر جب میں نے ڈاکٹر در کا دروازہ کھولا تو مجھ پر بجلی گر گئی۔ ڈاکٹر در کمرے سے باہر آرہا تھا اور رما کمرے کے اندر کپڑے پہن رہی تھی۔ خدا جانے اس نے مجھے دیکھا یا نہیں لیکن میں ایک سائے کی طرح اس کا پیچھا کرتا رہا۔ ڈی لکس بار میں اس نے کاونٹر پر بیٹھے بیٹھے تین چار پیگ پی لیے۔ آس پاس کے لوگوں کو آٹو گراف دیے۔ چاہنے والوں سے ہاتھ ملائے۔ کچھ اپائنٹمنٹ کیے۔ کلب میں جا کر کتنی ہی باہوں میں جھومتی رہی اور پھر وہ تاریکی میں جانے کہاں کھو گئی۔

آدھی رات کو کسی نے دستک دی تو میں نے دروازہ کھولا۔ سامنے وہی بدصورت چہرہ تھا جسے دیکھتے ہی مجھے کوفت ہونے لگتی ہے۔ وہی سوکھا سوکھا بدن جس میں نہ محبت کی گرمی اور نہ چاہت کا جذبہ۔ یہ للیتا تھی اور اس کی گود میں میرا بچہ تھا۔ وہ دونوں سردی سے ٹھٹھر رہے تھے۔ میں انہیں دیکھ کر تڑپ اٹھا لیکن جونہی انہیں گلے لگایا۔ برف کا بت ٹوٹ گیا اور میں دھنس گیا اور پھر ان کی تلاش میں چلتا ہی رہا۔ چلتا ہی رہا۔

اس وقت میرا کمرہ دھوئیں سے بھر گیا ہے لیکن آگ کہیں بھی نظر نہیں آتی۔ شاید میرا ہی دل چپکے چپکے جل رہا ہے اور رما مجھے پاگل سمجھ کر بجلی کے شاک دلا رہی ہے۔ لیکن میں پاگل نہیں ہوں۔ میں ایک خونخوار وحشی درندہ ہوں۔ اپنی بیوی کا خونی ہوں! اپنے بچے کا قاتل ہوں!!

مجھے بجلی کے شاک نہیں بلکہ پھانسی کا پھندہ چاہیے۔ میں ایک خونی ہوں۔ ایک قاتل ہوں۔ ہاں ہاں میں سچ کہہ رہا ہوں کہ للیتا گھوڑے سے پھسل کر نہیں مری ہے بلکہ میں نے اپنی بیوی کو بے رحمی سے قتل کر کے اسے منوں برف کے تودوں کے نیچے دفن کیا ہے۔ خدارا کوئی تو مجھے بھی اسی لحد میں سُلا دے یا پھر رما کے سوئے ہوئے پیار کو جگا دے نہیں تو میں گھٹ گھٹ کر مر جاؤں گا!

رما نے ڈائری کا ورق پڑھ کر شراب کے دو گھونٹ پیے اور پھر ڈائری کو تکیے کے نیچے رکھ کر البم کی ورق گردانی کرتی رہی۔ البم میں فقط تین تصویریں تھیں۔ ایک تصویر اس کے کالج کے ساتھی بھوشن

کول کی تھی، جس نے اپنے والدین کو ٹھکرا کر اس کے ساتھ لو میرج کر لی تھی لیکن شادی کے دوسرے دن ہی خودکشی کر لی۔ دوسری تصویر فلموں کے ڈائریکٹر ونود شرما کی تھی وہ اس کا دوسرا خاوند تھا لیکن اسے ٹھکرا کر دوسری شادی کر چکا تھا اور تیسری تصویر اس کی اپنی تھی جسے وہ اکثر اپنے چاہنے والوں کو فین میل کے ساتھ بھیجا کرتی تھی۔ البم کو سینے سے لگا کر وہ کھڑکی کھول کر ایک تنہا درخت کو دیکھتی رہی۔ اچانک ٹیلیفون کی گھنٹی نے اسے چونکا دیا اور ڈاکٹر درکی جانی پہچانی آواز سنتے ہی اس کا مرجھایا ہوا چہرہ کھل اٹھا۔

"رما دیوی! بمبئی سے آپ کی میڈیکل رپورٹ آ گئی ہے۔ لیکن مجھے ازحد افسوس ہے کہ آپ کا بھارت میں تو کیا دنیا کے کسی کونے میں اور کسی بھی قیمت پر آپریشن نہیں ہو سکتا۔ مرض پیدائشی ہے اور مجھے حیرت ہے کہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ آپ جسمانی تعلقات کے قابل نہیں ہیں۔ آپ بار بار شادی کیوں کر لیتی ہیں۔"

ڈاکٹر اور بھی کچھ کہتا رہا لیکن رما ملتجی آنکھوں سے ریسور کو دیکھتی رہی۔ پھر وہ اچانک چیخ پڑی اور اپنے پرکشش چہرے اور خوبصورت جسم کو اپنے ناخن سے کھرچنے لگی۔ اپنے مرمریں شانوں پر بکھرے سنہری بالوں کو نوچنے لگی، پھر آنکھیں بند کر کے بوتل کو منہ سے لگا کر غٹا غٹ وہسکی پینے لگی۔ لڑکھڑا کر دیواروں سے ٹکراتی رہی۔ گھنگھرو پہن کر گھنٹوں ناچتی رہی گاتی رہی چیختی رہی چلاتی رہی اور اس کا تیسرا خاوند ساتھ والے تنگ و تاریک کمرے میں لوہے کی بیڑیاں بجاتے زور زور سے آوازیں دیتا رہا اور اسے پکارتا رہا! - !

انتظار
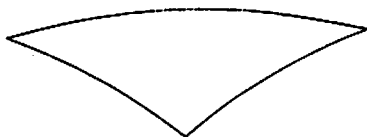
سواریوں سے بھری ایک بس جونہی سامنے سے گذری تو اسے ایسا لگا جیسے کوئی غیبی طاقت کائنات کو اٹھا کر تیزی سے بھاگی جا رہی ہو۔ ٹکٹکی لگائے وہ بس کو تب تک دیکھتا رہا جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو گئی رفتہ رفتہ سڑک کی چہل پہل بھی پانی کے بلبلے کی طرح غائب ہو گئی اور وہ دل شکستہ ہو کر بس اسٹانڈ کے چھت کے نیچے بیٹھا آس پاس ایسے دیکھتا رہا جیسے کسی گمنام جزیرے میں پھنسا ہوا مسافر کسی بچاؤ جہاز کی راہ دیکھ رہا ہو۔

سڑک ایک ویران سرائے کی طرح خاموش تھی۔ نہ کوئی آ رہا تھا اور نہ کوئی جا رہا تھا۔ فقط موسلا دھار بارش ہو رہی تھی اور کبھی کبھار خاموشی کو چیرتی ہوئی بادلوں کی گرج اسے ایسے چونکا دیتی تھی جیسے رات کی تنہائی میں ایک چھوٹے سے ریلوے اسٹیشن پر انتظار کرتے ہوئے تنہا مسافر کو سیٹی کی آواز ایک گیند کی طرح اچھل کر جب وہ سڑک پر تیزی سے دوڑتے ہوئے بارش کے پانی کو دیکھنے لگا تو سڑک کے ساتھ ساتھ لگے بجلی کے قمقموں کے دھندلے دھندلے عکس اسے نظر آنے لگے جیسے رعنائیاں ہاتھ پاؤں مار کر سمندر کی گہرائیوں میں ڈوبتے ہوئے بچاؤ کے لیے صدائیں دے رہی ہوں۔ سگریٹ کے ہلکے ہلکے کش لگاتے، دھویں کی لکیروں کو دیکھتے ہوئے جانے وہ کیا سوچ رہا تھا کہ اس کی نظریں پانی کی تہہ کو کاٹتے ہوئے دو حسین پیروں پر رک گئیں۔ گویا کوئی پرکشش رقاصہ ایک دودھیا آبشار کے اچھلتے ہوئے پانی سے گھنگروؤں کو بجاتے ہوئے ہلکے ہلکے سروں میں گاتے ہوئے اپنے پاؤں دھو رہی تھی یا پھر ایک صاف و شفاف جھیل میں سفید سفید بطخوں کی حسین جوڑی تیر رہی تھی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ سانسوں کی رفتار تیز ہوتی گئی اور اس نے سگریٹ کا آخری کش لے کر جب اس بے حد حسین راہ گذر کو غور سے دیکھا تو وہ تیزی سے ایسی بھاگی جا رہی تھی جیسے سنگِ مرمر کا تراشا ہوا ایک دلکش بت کسی بت خانے سے نجات پا کر

روح کی تلاش کر رہا ہو۔ ہانپتی ہوئی عورت جب اس کے سامنے رک گئی تو وہ مسرت سے جھومنے لگا۔ گویا جنت کی ایک حور اپنے دامن میں دنیا کی تمام خوشیاں لیے اس کی خالی جھولی بھرنے کے لیے آئی ہو۔ وہ سر سے پاؤں تک بھیگ چکی تھی۔ بھیگے کپڑوں سے لپٹے ہوئے اس کے گورے گورے بدن کی قربت کا احساس اس قدر سہانا تھا کہ چھونے کو جی چاہتا تھا جوان تھی گویا ایک سلگتا ہوا شعلہ جو دل کو جلا کر جسم کو تسکین دینے کا بھروسہ دلا رہا تھا۔ اس کے ہونٹ بہت پیارے تھے۔ آنکھوں میں چمک تھی اور آواز اتنی سریلی جیسے کوئی ایرانی مغنیہ اپنی نازک نازک انگلیوں سے ساز چھیڑ کر محبت کی داستان سنا رہی ہو۔ پانی کی بوندیں اس کے بالوں سے ایسی نکل رہی تھیں جیسے پھولوں کے جھرمٹ سے برسات کا پانی، قطرہ قطرہ اس کے خوبصورت گالوں کو چوم چوم کر اس کی نیم عریاں چھاتی کے آغوش میں ایسے پناہ لے رہا تھا جیسے عاشق کے دل میں معشوق کا پیار۔ وہ مخاطب یوں تھی جیسے شیریں جوئے شیر میں غوطہ لگا کر فرہاد کی منتظر ہو۔ بارش زور زور سے برستی رہی اور وہ دونوں آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال و جواب کرتے رہے۔ چند ہی لمحات کے بعد ایک سرگوشی نے احساسات کا سلسلہ توڑ دیا۔ گویا حسن کی دیوی بت، بت سے پرستش کی قیمت مانگ رہی تھی۔

اس نے جواباً ہاں میں سر ہلایا اور اقرار کے ساتھ ہی اس کے جسم میں ایک گرم لہر تیزی سے دوڑنے لگی۔ وہ اس کی کیفیت بھانپ گئی اور مسکراتے ہوئے جب اس نے اپنا گیلا آنچل نچوڑا تو ایک مضبوط گرفت نے اس کو دبوچ لیا۔ وہ بار بار اس کے بوسے لیتا رہا اور اس کے روئی جیسے نرم نرم جسم کو دباتا رہا۔ وہ چپ چاپ اس کی وحشیانہ اور احمقانہ حرکتوں کو دیکھتی رہی اور سب کچھ برداشت کرتی رہی۔ اچانک بادلوں کی گرج نے اسے چونکا دیا اور اسے ایسا لگا جیسے کوئی اسے آواز دے رہا تھا۔ پالیتھین کا ایک چھوٹا سا بیگ اپنے سینے سے لگا کر جب وہ اسکوٹر کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی تو سامنے ایک لمبی سڑک تھی۔ سڑک کے دونوں کناروں پر بجلی کے کھمبے مسلح سپاہیوں کی طرح ٹکٹکی لگائے ایسے کھڑے تھے جیسے وہ سب کے سب اس کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔

اسکوٹر اسٹارٹ ہوا تو تیز روشنی نے دھندلی دھندلی روشنی پر غلبہ پایا۔ اسے ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ ایک ہوائی گھوڑے پر سوار ہو کر پریوں کے دیش جا رہی تھی۔

"دیکھو! کہاں جانا ہے۔؟" ایک کھردری آواز نے اسے چونکا دیا۔

"پہلے جہاں تم لے چلو اور پھر اسی سڑک پر آگے ایک نئی بستی ہے۔ بستی کیا چند بے گھر لوگوں کے کھوکھے ہیں۔"

اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتی ایک زور کے دھماکے کے ساتھ اسکوٹر سڑک پر رگڑتا ہوا ایسے رک گیا جیسے کوئی راہی پہیوں کے نیچے کچلا گیا ہو۔ لائٹ آف ہوگئی اور سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اس نے جلدی سے اپنے بازو کے ہوک کھول دیے اور آہستہ سے کہنے لگی۔

"لیکن یہ تو سڑک ہے یہاں کیوں روک دیا؟"

"اسکوٹر آگے نہیں جائے گا" آواز میں بے رخی تھی۔

"ٹھیک ہے میں تیار ہوں"

"لیکن مجھے یہ سودا منظور نہیں" آواز میں تلخی آنے لگی۔

"کیوں! میں خوبصورت نہیں" وہ فریاد کرنے لگی۔

"سفر بہت لمبا ہے۔ کم از کم دس روپے کا میٹر بن جائے گا" وہ یک دم موسم کی طرح بدل گیا اور اس کا چہرہ ایسے تھا جیسے تپتے ہوئے پربت نے اچانک برف کی چادر اوڑھ لی ہو۔

"تم خاموش کیوں ہو...... بھگوان کے لیے میری بات مان لو اور مجھے اپنی منزل پر پہنچا دو۔ میرے بچے بھوک سے بلک بلک کر رو رہے ہوں گے اور میرا مرد دوائی کے لیے ترس رہا ہوگا"

"تو میں کیا کروں۔ میں بھی بھوکا ہوں۔ میرے پاس نہ روٹی ہے اور نہ دوائی۔ فقط ادھار کا ایک لیٹر تیل ہے" وہ کھانستے ہوئے کہنے لگا۔

بادل گرجتے رہے۔ پانی برستا رہا اور وہ دونوں سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر ایسے ٹہلنے لگے جیسے ایک کلینک کے باہر کینسر کے دو مریض۔ وہ سواری کا منتظر تھا اور وہ بس، اسکوٹر، ٹیکسی یا کار کی تلاش میں تھی۔ دونوں دور دور تک نظریں دوڑا کر جانے کب تک انتظار کرتے رہے۔
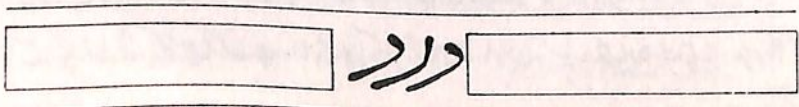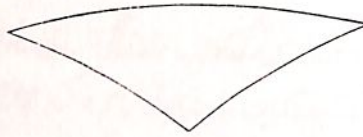
بابا نے انگلی سے چراغ کی باتی آگے کی تو دھندلی روشنی اجالے میں تبدیل ہوگئی۔ سامنے قالین پر بیٹھا سیٹھ اور اس کی بدصورت سیٹھانی ملتجی نظروں سے بابا کو دیکھتے رہے گم گم جب کہ دور دہلیز پر انتظار کر رہی ریشماں یہی دعا کرتی رہی کہ کب سیٹھ اٹھ کر جائے اور وہ بابا کے قدموں میں گڑگڑا کر منت مانگے اور فریاد کرے کہ بابا میرے بچوں کو کھانا دے ورنہ ان سے ان کو دی گئی سانسوں کی امانت واپس لے۔ حالانکہ سبھی کے ہونٹوں پر مہرِ خاموشی لگی تھی مگر بابا کا کیا۔ وہ تو دلوں کے حال بہتر جانتا ہے۔ اس کو معلوم ہے کہ سیٹھانی اولاد کے لیے ترس رہی ہے اور سیٹھ اپنے وارث کی کمی محسوس کر رہا ہے جب کہ ریشماں بہت سارے بچوں کی ذمّہ داری کے بوجھ کے نیچے دبے جا رہی ہے۔ بیچاری معصوم تو ہے ہی مگر لگتا ہے مظلوم بھی ہے۔ اور وہ بھی پیدائشی۔ کئی جنموں سے اپنے کرموں کا پھل بھگت رہی ہے نا۔ اس کا مرد بچے پیدا کرنے کے علاوہ کرتا ہی کیا ہے۔ بابا کی خوب سیوا کرتی ہے اور شاید یہ بھگتی کا ہی پھل تھا کہ پچھلے تین سال سے وہ حاملہ نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے نہیں کہ اس کا شوہر احتیاط برتتا ہے یا پرہیز کرتا ہے بلکہ اس لیے کہ ایک تو بابا کا کرم ہے اور پھر وہ ٹی۔ بی ہسپتال میں داخل ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر سمجھ رہے ہیں کہ اس کے دونوں پھیپھڑے خراب ہو چکے ہیں۔ ریشماں اس کی سلامتی کے لیے دعا کرنے بھی آتی ہے اور یہ سوچ کر کہ بابا اس کے مرد سے خفا نہ ہو وہ اپنے مرد کا کام بھی کیا کرتی ہے۔ یعنی بابا کے مقدس آتش دان کے لیے جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لے آتی ہے۔ بابا کو کیا یہ سب معلوم نہیں۔؟ وہ بڑا مہربان ہے دور بیٹھی ریشماں سے مخاطب ہو کر اپنے مخصوص سرگوشیانہ انداز میں بولا "تو بیٹی ہے۔ ماں ہے۔ یہ لے آم۔ اپنے بچوں کو کھلا۔ ڈر کیوں رہی ہے۔ ایک دو کیا سارے کے سارے لے جا۔ بہت ہیں میرے پاس۔ سیٹھ لے آیا ہے۔ نا بھی لے آتا تب بھی میرے پاس کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ اس زمین کے نیچے خدا نے کیا کچھ نہیں رکھا ہے۔ اناج۔ لوہا۔ کپڑا۔ مکان کا سامان۔ کھیت میں درخت میں۔ ہے نا؟"

ریشماں اپنے دل کی بات دل ہی میں رکھ کر جب جانے لگی تب بابا نے اس کو روکا۔ اور سیٹھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "اپنی شریکِ حیات سے کہہ دو کہ اپنا یہ زرق برق لباس اتار کر ریشماں کو دے دے۔ بلکہ خود ہی اس کو اپنا لباس پہنا کر اس کا پرانا لباس پہن لے۔ دیکھ لینا من کی مراد پوری ہو گی۔"

سیٹھانی اچھل کر دوسرے کمرے میں چلی گئی اور اپنے ساتھ ریشماں کو گھسیٹ کر لے گئی۔

ریشماں حیران ہونے کے ساتھ پریشان بھی ہو رہی تھی اور حکم کی تعمیل کر کے جب وہ باہر آئی تو سیٹھ کو لگا جیسے اب کمرے میں اجالا ہو گیا۔

بابا دلوں کے بھید بہتر جانتا ہے۔ سیٹھ کی کیفیت سمجھ گیا۔ بھلا اس کو غصہ کیوں آتا۔ اس لیے کچھ بولا بھی نہیں۔ چراغ کی روشنی دھیمی ہو گئی بابا کا کمرہ ایک تاریک غار بن گیا۔ اپنی ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی کے قریب چوتھے دن بھی سیٹھ نے ریشماں کو کار سے اتارا تب اس کے بچے اپنی ماں کو چمکیلے لباس میں دیکھ کر خوشی سے اچھل پڑے۔ دادی ماں نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ ایک دن ایک پری آسمان سے اتر کر سیدھے ان کے دروازے پر دستک دے گی۔ اس کے ہاتھوں میں ڈھیر سارا کھانا ہو گا۔ آلو ٹماٹر کا ساگ۔ اِملی کی چٹنی اور روٹیاں اتنی کہ بس کھاتے ہی رہو۔

کچھ دنوں بعد سیٹھ کے گھر سے لایا ہوا کھانا بچوں میں بانٹتے ہوئے ریشماں کو الٹیاں آنے لگیں تب وہ زور سے چیخ پڑی۔

دوڑتی بھاگتی جب وہ بابا کے دربار میں پہنچی تب بابا نے مسکرا کر پوچھا۔ "بچوں کو روٹی مل رہی ہے نا؟ مالک کسی کو بھی بھوکا نہیں سونے دیتا ہے۔ مگر تم اس قدر خوفزدہ کیوں ہو رہی ہو؟ بچے تو بھگوان کا روپ ہوتے ہیں اور مالک نے ہر آنے والے کے لیے اس کا حصہ زمین میں چھپا رکھا ہے۔ میرا یہ وعدہ ہے کہ تمہارا کوئی بچہ بھوکا نہیں رہے گا۔"

ریشماں نے لب سی لیے اور کر بھی کیا سکتی تھی۔ بابا دلوں کے بھید جانتا ہے۔ اگر مرض اس کا دیا ہوا ہے تو مریض بھی اس کا ہے۔ اپنا۔ بہت ہی پیارا۔ آہ بھر کر وہ پھر دہلیز پر بیٹھی بیٹھی سوچتی رہی کہ اگر غریبی گناہ ہے تو گناہ گار کو سزا ملتی ہے مگر مجرم کو کیا کوئی سزا نہیں دے سکتا؟ بابا بھی نہیں؟ سوچا آج من کی بات ہونٹوں پر لے آؤں کیونکہ اس کا جسم ایک پکے پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا اور اس وقت بھی اس کو محسوس ہو رہا تھا گویا سیٹھ ایک بھوکے بھیڑیے کی طرح اس کے جسم کو دبوچ کر زخموں میں انگلیاں ڈال رہا ہے۔ بالکل ویسے

ہی جیسے سونے کی کان میں پھیلی ہوئی گیس نے اس کے شوہر کے پھیپھڑوں کو لہولہان کر دیا تھا باسب کچھ جانتا ہے۔ کوئی کچھ نہ بھی کہے تب بھی سب جانتا ہے۔ دلوں کے بھید۔ مسائل کے حل!

آنکھیں بند کر کے وہ اپنے سرگوشیانہ انداز میں بڑبڑانے لگا۔ "چلی جا۔۔ چلی جا۔۔ تمہارا مرد دم توڑ رہا ہے۔ جانے والے کو دو گھونٹ پانی تو پلا دے ورنہ اگلے جنم میں بھی بھوکا پیاسا رہے گا۔"
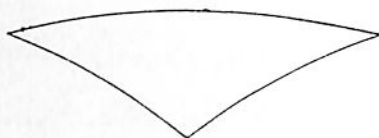
مچھلی جال میں پھنس گئی تھی مگر اس کو یوں لگ رہا تھا گویا وہ ایک بہت بڑا دروازہ کھلتے ہی ـــــ پریوں کے دیش میں داخل ہوگئی ہے اور سیڑھیوں پر رکھے ہوئے نرم نرم استقبال کے رنگ برنگی پھولوں پر اپنے نازک نازک پاؤں رکھ کر وہ آہستہ آہستہ اپنے خوابوں کے شہزادے کے قریب جا رہی ہو۔ بالکل ویسے ہی جیسے اس کی ماں کہا کرتی تھی۔

اچانک مچھیرے نے جال کھینچا اور مچھلی نے پانی سے باہر نکلتے ہی پہلے نیلے نیلے آکاش کو دیکھا اور پھر اس کو یوں لگا جیسے بادلوں کی سیڑھی سے اتر کر ایک شہزادہ ساحل پر کھڑے لوگوں کی بھیڑ میں کھو گیا وہ پھدکنے لگی۔ چھلانگیں لگانے لگی مگر سوال یہ تھا کہ وہ شہزادے کو پہچانے کیسے ۔ ماں نے کہا تھا وہ سفید پر والے گھوڑے پر سوار ہوگا اور جل پری کی تلاش کر رہا ہوگا۔ وہ جب بھی اس شہزادے کا ذکر کرتی تھی تب اس کی سہیلیاں اس کو نادان سمجھ کر ہنس پڑتی تھیں۔ مگر بے چاری مچھلی کا کیا دوش ہے۔ قصور تو اس کی ماں کا ہے جو مرتے دم تک اس کو پریوں کے دیش کی کہانیاں سنایا کرتی تھی۔ حسن کے چور اور راجکماروں کی داستانیں سنایا کرتی تھی۔ اندر سبھا کی رقاصاؤں رمبھا۔ سنبھا اور مینکا کے بارے میں کہا کرتی تھی ورنہ اس کو کیا معلوم تھا کہ رقص کیا ہوتا ہے۔ پازیب کیا ہوتے ہیں۔ جسم کیا ہوتا ہے اور خوبصورتی کیا ہوتی ہے سب کچھ جان کر مچھلی کو یقین ہوگیا تھا کہ وہ بہت خوبصورت ہے اور وہی جل پری ہے جس کی تلاش میں ایک خوبصورت شہزادہ ہوائی گھوڑے پر سمندر کے ارد گرد چکر لگاتا ہے۔

"یہ مچھلی بہت ہی خوبصورت ہے۔" مچھیرے نے مچھلی کو جال سے نکال ایک بہت بڑے ٹب میں ڈال دیا۔ مچھلی سمجھ بیٹھی کہ شہزادے نے اس کو اس کا ہاتھ پکڑ کر پانی سے باہر نکالا ہے۔ وہ کچھ کچھ گھبرائی اور اپنے آپ پر فخر کرنے لگی۔ میں ہی سندر ہوں یہ تو ودھاتا کا کرم ہے ورنہ سمندر تو مچھلیوں سے بھرا پڑا ہے۔

وہ شاید خوشی سے جھوم کر گا اٹھتی مگر اچانک اس کو یوں لگا جیسے کوئی اس کا گلا دبوچ رہا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے اوپر بہت ساری مچھلیاں یوں گرتی رہیں گویا کوئی ظالم شکاری کم گہرے پانی میں مچھلیوں کا شکار کرنے کے لیے پتھر پھینک رہا ہو۔

مچھلی کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا اور وہ سوچنے لگی کہ مچھیرا وہی شکاری تو نہیں ہے جس نے اس کی ماں کے منہ میں کانٹا ڈال دیا تھا اور پھر اس کا گوشت کھا کر ہڈیوں کا ڈھانچہ پانی میں ڈال دیا تھا۔

ماں کا خیال آتے ہی اس کو وہ دن بھی یاد آیا جب اس کے باپ نے مقابلہ کرنے یا بدلہ لینے کے بجائے آہ بھر کر یہ کہا تھا۔ ارے بھاگیہ وان تھی تمہاری ماں جو ہڈیاں گہرے پانی میں ڈالی گئیں۔ ورنہ بے چاری کو نرک میں جگہ ملتی اور آتما اشانت رہتی۔

مچھلی کا خواب ٹوٹ گیا اور جب اس کو معلوم ہوا کہ مچھیرا مچھلی کو منڈی میں بیچ رہا ہے تب اس پر بجلی گر گئی۔ گویا یہ شخص شہزادہ نہیں بلکہ گوشت فروش ہے۔

مچھلی بھگوان کو کوسنے لگی۔ کیوں بنایا مجھے ایک مچھلی۔ پانی میں ہی رکھنا تھا تو مگر مچھ کیوں نہیں بنایا مجھے۔ اب میں تمہاری پوجا نہیں کروں گی۔ تم پالن ہار نہیں ہو۔ میں بک رہی ہوں اور تم کچھ کرتے نہیں۔ دروپدی کو تم نے ننگا ہونے سے بچایا تھا۔ میں بک رہی ہوں اور تم کچھ بھی نہیں کرتے۔

مچھلی رو پڑی اور شاید بھگوان نے اس کی فریاد سن لی ایک نہایت خوبصورت عورت نے مچھیرے کو مچھلیوں کی قیمت دے کر کہا مچھلیوں کو پانی میں ڈال دو۔

مچھیرے کو معلوم تھا کہ یہ عورت کوئی اور نہیں بلکہ شہر کی بدنام رقاصہ ہے جو امیروں کی منظور نظر طوائف بھی ہے۔ رقم لے کر پوچھا کہ یہ ثواب کا کام کیوں کر رہی ہو۔

رقاصہ نے عقیدت سے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا منت مانگی تھی اب اتار رہی ہوں پر بھو کی مایا دیکھو۔ سڑک پر مل گئی یہ پیاری سی بچی۔ اب میں بڑھاپے کا بوجھ اٹھا سکوں گی۔ اس لڑکی کے کندھوں پر رکھ کر مچھلی نے رقاصہ کی ایک جھلک دیکھ لی اور دعائیں دیتی ہوئی گہرے پانی کی طرف جانے لگی۔ وہ بہت ہی خوفزدہ تھی اور اس کا خواب ریزہ ریزہ بکھر کر سمندر کی گہرائیوں میں ڈوب چکا تھا۔ اب وہ خوابوں کے شہزادے کو بھول کر کسی مچھلی کا ہاتھ پکڑ کر پانی میں ہی گھر بسانے کے بارے میں سوچتی رہی۔ مگر اچانک اس کو یوں لگا

جیسے وہ پھر پھنس گئی ہے۔

مچھلی رو پڑی مگر اچانک رحم دل رقاصہ کا خیال آتے ہی سوچنے لگی کہ وہ پھر مچھیرے کو قیمت دے کر مجھے پھر سے پانی میں ڈال دے گی۔ وہ دعائیں مانگنے لگی۔ پر بھوسٹرک پر کسی اور لڑکی کو دیکھ کر مجھے بچا دے۔ اب محلوں کے خواب ہرگز ہرگز نہیں دیکھوں گی۔

بے چاری مچھلی کو کیا معلوم تھا کہ اس بار وہ مچھیرے کے جال میں نہیں بلکہ ایک موٹی مچھلی کے پیٹ میں چلی گئی ہے۔ یہ کہانی بہت پرانی ہے مگر تب سے اب تک نہ بے چاری مچھلی بدلی اور نہ ہی بدلا جال بے بس مچھلی کر بھی کیا کر سکتی ہے جب جل ہی سارا جال ہے۔
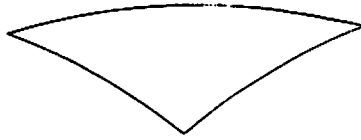
ڈاکٹر لوگ پریشان تھے یا نہیں مگر میں بہت پریشان تھا کہ بابا ٹھیک کیوں نہیں ہو رہا ہے۔ مگر آدھی رات کو جب میں نے بابا کا تھیلا دیکھا تو میرے پاؤں تلے زمین نکل گئی۔ خدایا کیا تیری زمین پر ایسا بھی ہوتا ہے۔ بابا اور میں دونوں مریض ہیں۔ میرا بیڈ نمبر بیس ہے اور اس کا اکیس۔ جب بھی ڈاکٹر لوگ وارڈ میں راؤنڈ پر آتے ہیں تب بابا تو بے ہوش پڑا ہوتا ہے یا پھر وہ زور زور سے چلاتا ہے۔ ہائے میں مر گیا میرے پیٹ میں آگ جل رہی ہے۔ مجھے بچاؤ۔ مجھے بچاؤ۔ حالانکہ ڈاکٹر لوگ اس کو بار بار بتاتے ہیں کہ تمہارے پیٹ میں رسولی نہیں ہے مگر وہ ہاتھ جوڑ کر بلکہ رو رو کر پوچھتا ہے۔ پھر میں ٹھیک کیوں نہیں ہو رہا ہوں۔ بڑا ڈاکٹر مہربان ہے اس لیے وہ بھی ہاتھ جوڑ کر جواب دیتا ہے تمہارے مرض کا علاج دوائی ہے بس کھاتے رہو۔ ٹھیک ہو جاؤ گے۔

میرا مرض تو لاعلاج ہے۔ یہ میں جانتا ہوں اس لیے نہ میں ڈاکٹر سے سوال پوچھتا ہوں اور نہ وہ جواب دیتے ہیں اور پھر رونا کس بات کا۔ پچھلے جنموں کا پھل بھوگنا ہی ہے۔ یہ بات نہیں کہ مجھے زندگی سے پیار نہیں مگر کیا کروں اپنے زخموں پر اپنی ہی ہمدردی کا مرہم لگا کر تسلیاں دیتا رہتا ہوں۔ ایک نہ ایک دن تو سب کو مرنا ہے۔ یہ بات نہ جانے میں بابا سے کیوں نہیں کہہ سکا حالانکہ اس کی عمر تقریباً ۷۰ سال ہے شاید اس لیے کہ اس کی مرجھائی ہوئی آنکھوں میں جھانک کر دیکھتا ہوں تو آشا اور نراشا کے ملے جلے تاثرات دیکھ کر تڑپ اٹھتا ہوں۔ نہیں دیکھی جاتی مجھ سے اس کی حالت سوچتا رہتا ہوں جانے کب اور کس وقت وہ آخری سانس لے۔ کون کرے گا اس کا کریا کرم۔ پچھلے دو ماہ سے دیکھ رہا ہوں کہ کوئی اس کو دیکھنے بھی نہیں آتا۔ جبھی تو رات کو جب وہ کروٹ لیتا ہے تو میں پلٹ کر دیکھتا ہوں کہ کہیں بابا چل تو نہیں بسا۔

مجھے نیند آتی نہیں ہے یہی میری ہولناک بیماری کی علامت ہے مگر تعجب ہے کہ بابا کیسے گہری نیند

سوتا ہے۔ کیا معلوم اس کی بیماری۔ سو جاتا ہو یا بےہوش ہو جاتا ہو۔ آج رات بھی وہ کھانا کھاتے ہی سو گیا۔ آدھی رات کو جب مجھے سردی لگی تو میں نے دیکھا کہ وارڈ کے تمام مریض سو رہے تھے بابا انجیکشنوں کے زیرِ اثر بےہوش تھے۔ نرس اور وارڈ کا عملہ بھی سو رہا تھا۔ صرف میں جاگ رہا تھا۔ کسی نے غلطی سے ساتھ والی کھڑکی ادھ کھلی چھوڑ دی تھی اس لیے بابا کو بھی میری طرح سردی لگ رہی تھی۔ لیکن پھر بھی وہ سو رہا تھا۔ اس کا جسم یوں سکڑ گیا تھا جیسے بچہ دانی میں بچہ۔ مجھے ترس آ گیا۔ آنکھیں بھر آئیں اور میں نے ایک کمبل اٹھا کر اس کے جسم پر ڈال دیا۔ اچانک میری غلطی سے یا یوں کہیے بابا کے کمبل ٹھیک کرتے ہوئے بابا کے سرہانے کے نیچے رکھا ایک چھوٹا سا میلا کچیلا تھیلا فرش پر گر گیا۔ یہ سوچ کر کہ تھیلے میں بابا نے میری طرح کسی اپنے کی یا پھر بھگوان کی تصویر رکھی ہوگی میں نے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر دیکھا کہ کہیں تصویر ٹوٹ تو نہیں گئی۔ مگر تھیلے میں کچھ اور تھا۔

صبح ہوئی تو بابا معمول سے پھر چلانے لگا۔ دودھ آ گیا، وہ پی لیا۔ انڈا کھا لیا۔ ڈبل روٹی کھا لی اور کھاتے وقت وہ بالکل نہیں رویا۔ بلکہ بہت ہی تیز رفتار سے کھانا کھاتا رہا۔ شاید اس لیے نہیں رویا کیونکہ دونوں کام وہ ایک ساتھ نہیں کر سکتا تھا۔ پھر جب ڈاکٹر لوگوں کے آنے کا وقت قریب آ گیا تب وہ پھر چلانے لگا۔ ڈاکٹر لوگ اس کے قریب رک گئے۔ اس کے چارٹ پر کچھ لکھا اور پھر اگلے بیڈ پر چلے گئے۔ کچھ دیر بعد ایک نرس آئی۔ دوائیاں دے گئی۔ بابا نے ٹکیاں گن کے لیں اور جب وہ چالاکی سے پوجا کے بہانے یہ ٹکیاں اپنے تھیلے میں ڈالنے لگا تب میں نے فوراً اپنی آنکھوں پر رکھے تکیے کو ہٹا دیا۔ کیونکہ میں جھانک جھانک کر سب دیکھ رہا تھا۔

بابا چونک پڑا۔ پہلے وہ یوں ڈر گیا جیسے میں اس کا ساتھی مریض نہیں تھا بلکہ ایک جلاد تھا۔ جب میں مسکرا دیا تو اس نے ملتجی نظروں سے مجھے دیکھا گویا یہ احساس دلا رہا ہو کہ واسطہ ہے تمہیں اسی درد کے رشتے کا۔ کسی کو کچھ مت بتا دینا۔

رات کو جب کھانا کھانے سے پہلے وہ معمول کی طرح اپنا پیٹ پکڑ کر رونے لگا تب میں نے قریب جا کر پوچھا۔ بابا میں کسی کو کچھ بھی نہیں بتاؤں گا مگر ایک شرط پر۔ وہ یہ کہ تم مجھے یہ بتا دو۔ دوائی کیوں نہیں کھاتے؟ بے ذائقہ ہے اس لیے یا کوئی اور وجہ ہے۔

بابا کے ہونٹ تھرتھرانے لگے۔ گویا وہ تذبذب میں تھا کہ کیا کروں بھروسہ کر کے بتا دوں یا اپنے بچاؤ کے لیے خاموش رہوں۔

میں نے اصرار کیا تو اس نے سرگوشیانہ انداز میں بتایا "اس لیے نہیں کھاتا کیونکہ ہسپتال میں رہ کر دو وقت کا کھانا کھا کر ہی ٹھیک ہو جاتا ہوں۔ میرے پیٹ میں اگنی جل رہی ہے۔ رسولی نہیں ہے ہاں جس دن میرا جھوٹ پکڑا جائے گا ہسپتال سے چھٹی مل جائے گی پھر گھر جا کر یہی ٹکیاں کھاتا رہوں گا۔ پوری ۷ ٹکیاں ہو گئی ہیں۔ یہاں سے جانے کے بعد کم از کم ایک مہینہ تو زندہ رہوں گا۔ دوائی آگ بجھا دے گی نا؟"

صبح سویرے کہاں لے جا رہے ہیں مجھے یہ لوگ ؟ پاگل ہو گئے ہیں کیا جو گھسیٹ کر لے جا رہے ہیں؟ کیسے جاہل ہیں۔ میرے نرم نرم بالوں کو کھینچے جا رہے ہیں۔ بے وقوف جانتے نہیں کہ چھوٹے مالک نے یہ سب دیکھ لیا تو کھال اتار دیں گے سب کی۔ آنے دو چھوٹے مالک کو۔! مگر وہ تو سوئے ہونگے اپنے کمرے میں۔ دراصل کل رات پارٹی تھی نا بہت دیر سے سوئے ہونگے۔ وہ۔ میم صاحب کون تھی جو اپنے ساتھ شراب کی بوتلیں لائی تھی۔ ہا۔ہا۔ ہا۔ شراب تو دوائی کے طور پر بھی پی جاتی ہے۔ میں نے بھی ایک بار پی ہے۔ ہاں جب میں بہت چھوٹا تھا۔ برف گر رہی تھی اور میں بیمار ہو گیا تھا۔ میری حالت دیکھ کر چھوٹے مالک رو پڑے تھے۔ کتنا پیار کرتے ہیں چھوٹے صاحب مجھ سے دراصل وہ آدمی ہی بہت پیارے ہیں۔ اپنی انگلیوں سے جب وہ میرے بالوں کو چھوتے ہیں تو تھوڑی دیر کے لیے مجھے بھی ایسا لگتا ہے جیسے یہ بال میرے نا ہو ں۔ چھوٹے صاحب کی کسی دوست لڑکی کے بال ہوں۔ ارے ارے۔ دوست لڑکی نہیں۔ چھوٹے صاحب GIRL FRIEND کہتے ہیں ان کو۔ وہ سب لڑکیاں بلکہ چھوٹے مالک کے کارخانے میں کام کرنے والے سب لوگ چھوٹے مالک کو مالک کیوں کہتے ہیں۔ ماں تو کہا کرتی تھی کہ مالک تو بھگوان ہوتا ہے! تو کیا بڑا مالک بڑا بھگوان اور چھوٹا مالک چھوٹا بھگوان ہوتا ہے۔ ؟۔ کیا معلوم ہوں۔ مگر بھگوان تو ہم سب کو پیدا کرتا ہے۔ تو کیا بڑے مالک۔ نہیں نہیں۔ چھوٹے مالک نے ہمیں پیدا کیا ہے۔ ضرور پیدا کیا ہوگا ورنہ اتنا پیار کوئی کسی سے کرے کیوں۔

چھوٹے مالک مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں اس لیے میں کسی سے بھی نہیں ڈرتا ہوں۔ حالانکہ برادری کے لوگ ہر رات خوفناک کہانیاں سنا کر ڈرایا کرتے ہیں۔ ارے بابا یہ کوئی بادشاہت کا زمانہ تو ہے نہیں کہ کوئی بس سر قلم کر دے۔ ہونہہ۔ بزدل ہیں۔ دراصل ان پڑھ ہیں نا۔ آدی واسیوں کی طرح۔ لیکن میں لکھا تو نہیں پڑھا ضرور ہوں۔ اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے۔ چھوٹے مالک جب میرے بالوں کو انگلیوں سے چھیڑتے ہیں تب ضرور کچھ نہ کچھ کہتے رہتے ہیں۔ جبھی تو مجھے معلوم ہے کہ یہ سال لیپ سال ہے۔ راجیو گاندھی وزیر اعظم ہند ہے۔ ہاں ہاں، ٹی وی بھی کبھی کبھار دیکھ لیتا ہوں۔ یقین نہ آئے تو میں کیا کروں۔ سنو پھر ایک بات بتا دیتا ہوں۔ جب میں چھوٹا تھا تو چھوٹے مالک مجھے اپنے کندھے پر اٹھا کر

اپنے کمرے میں لے جایا کرتے تھے۔ ایک بار تو فوٹو بھی کھینچوائی تھی۔ جی ہاں! وہ اخبار میں بھی چھپ گئی تھی۔ اپنی تصویر دیکھ کر کتنا مزہ آتا ہے۔ ہے نا۔؟

چھوٹے مالک مجھے کبھی کبھی سیر کے لیے لے جایا کرتے ہیں۔ چند دن پہلے جب وہ بُت بنانے کی خاطر کمہار سے مٹی لینے گئے تھے تو میں بھی ان کے ساتھ گیا تھا۔ جانتے ہو وہاں کیا ہوا۔ مجھے پیاس لگی مگر میں نلکے سے بھلا کیسے پانی پی سکتا تھا۔ چھوٹے مالک سمجھ گئے۔ فوراً ایک مٹی کا برتن خرید لیا۔ جی ہاں میرے پانی پینے کی خاطر۔ کتنے اچھے ہیں میرے چھوٹے مالک۔ لیکن جانے میری ماں کو کیا ہو گیا تھا وہ ہر وقت چھوٹے مالک پر شک کیا کرتی تھی۔ پاپ کرتی تھی نا؟ اسی لیے تو۔!۔! اوف مجھے رونا کیوں آ رہا ہے۔ حالانکہ آنا نہیں چاہیے۔ چھوٹے مالک نہ تو مجھے ماں کی کمی محسوس ہونے دیتے ہیں اور نہ ہی اس چھوٹے منے کو باپ کی کمی محسوس ہونے دیتے ہیں جو روز ان کے جوتے پالش کرتا ہے، بہت پیار کرتے ہیں وہ ہم دونوں کو۔ میری ماں پاگل تھی جو ہمیشہ اُوٹ پٹانگ بکا کرتی تھی۔ ارے ایسے لوگوں کو تو۔ ماں کچھ نام لیتی تھی اچھے لوگوں کا ذکر کرتے وقت۔ ہاں۔ ہاں۔ یاد آیا۔ فرشتے، فرشتے اچھا نام ہے نا؟ بس چھوٹے مالک بھی فرشتے ہیں۔ نہیں نہیں وہ اچھے لوگوں کو گوتم کے نام سے یاد کرتی تھی۔ چھوٹے مالک بھی کیا گوتم ہیں؟ نہیں۔ گوتم تو اس کمہار کا نام ہے جو روز مٹی کے تودے توڑتا ہے۔ پھر مٹی میں پانی ڈالتا ہے۔ ہوا بھی ڈالتا ہو گا اور پھر وہ مٹی کو آٹے کی طرح گوندکر چکی چلا کر پیارے پیارے برتن بنا لیتا ہے۔ کھلونے بھی۔ واقعی گوتم ایک کاریگر ہے۔ اس نے مٹی کا شیر بنایا ہے۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔ جری مٹی کا شیر دیکھ کر بھی ڈر جایا کرتی تھی۔ میں تو نہیں ڈرتا ہوں۔ کیوں ڈروں بھلا۔ ارے چھوٹے مالک کا لاڈلا ہوں۔ چلو لاڈلا نہ سہی پیارا تو ہوں۔ چھوٹے مالک یہ مورتیاں کیوں بناتے رہتے ہیں۔ اگر کبھی ان مورتیوں میں جان آ گئی تو۔ !۔؟ یہ شیر کیا گرجنے لگے گا؟ مجھے کھا جائے گا کیا؟ مگر میں نے اس کا کیا بگاڑا ہے۔ پوچھے گا تو بتا دوں گا کہ میں امن کا حامی ہوں۔ چلو جنگل کا راجہ ہے سلام کرتا رہوں گا۔ مگر میں شیر کی باتیں کیوں کرنے لگا۔ ہاں بات چھوٹے مالک کی ہو رہی تھی۔ واقعی وہ ہنرمند ہیں۔ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ اس روز جب مجھ خارش ہوئی تھی تو میرے بدن پر اپنے ہاتھوں سے مالش کر کے خارش کو یوں بھگایا تھا جیسے سانپ کو دیکھتے ہی مینڈک بھاگ جاتی ہے۔ مگر!۔ مگر!؟۔ اگر سانپ نے چپکے سے وار کر کے مینڈک کو دبوچ لیا تو؟۔ اف میرا گلا کیوں خشک ہو رہا ہے۔ شاید ماں کی یاد آ رہی ہے۔ لیکن مجھے کس کا ڈر ہے؟ کسی کا نہیں۔ میں اکیلا تو نہیں ہوں۔ چھوٹے مالک جو میرے ساتھ ہیں۔ ویسے تو وہ سبھی سے پیار کرتے ہیں۔ غریبوں کے دوست ہیں۔ کل ہی تو ٹی وی پر ان کا انٹرویو آیا تھا اور یہ بھی بات تو

فیصری ہی۔ ماں گھر میں برتن صاف کرتی ہے اور بیٹی کو چھوٹے مالک اپنے ساتھ پلنگ پر بٹھا کر انگور کھلا رہے ہیں یہ غریب پروری نہیں تو اور کیا ہے بھئی۔ ہاں ہاں میری ماں بھی غریب تھی مگر اس نے ضرور کوئی پاپ کیا ہوگا ورنہ کیوں سزا ملتی اسے۔ اف کتنا خون نکلا تھا اس کے گلے سے۔ خون کا دریا۔ کاش ماں نے بڑے مالک کا اشارہ سمجھ لیا ہوتا۔ خود بخود ساتھ چلی جاتی کم از کم گھسیٹ کے تو نہیں لے جاتے نا بیچاری کو۔ بھلا ہو چھوٹے مالک کا جو مجھے اس وقت اپنے ساتھ لائے تھے۔ ورنہ۔ ورنہ لوگ یہی بتاتے کہ تمہاری ماں کو شیر کھا گیا یا پھر کینسر۔ کچھ ہو مجھے وہ منظر بار بار یاد آرہا ہے اب۔ جب میری ماں کی کھال اتاری گئی تو میں نے سوچا شاید کھال اتار کر کفن ڈالا جا رہا ہے۔ مگر نہیں۔! بدن رہا ہی کہاں اب۔ گوشت کے ٹکڑے ہی ٹکڑے نظر آرہے ہیں۔ گوشت کو کوٹ کوٹ کر قیمہ بنایا جا رہا ہے۔ بالکل ویسے ہی جیسے کمہار مٹی کو گوندھ گوندھ کر برتن بنا رہا تھا۔ ارے۔ یہ کمہار والی بات مجھے پہلے یاد کیوں نہیں آئی۔ ماں تم فکر نہ کرو۔ ترکیب ذہن میں آگئی ہے۔ تمہارا نیا جنم ہوگا۔ معلوم ہے کیسے؟ آسان سی بات تو ہے۔ میں چھوٹے مالک سے کہہ دوں گا کہ اس قیمے کو گوندھ کر تمہیں بنا ڈالے اور پر اوڑھنے کے لیے کھال جو ہے اور وہ سر بھی تو وہاں موجود ہے۔ ہاں۔ واہ۔ ماں جب میرے قریب آئے گی تو میں لپٹ جاؤں گا اس کے ساتھ۔ مگر یہ کام بڑے مالک تو کرنے نہیں دیں گے؟ لیکن میں سمجھا دوں گا نا کہ پاپ کیا تھا ماں نے پچھلے جنم میں۔ سزا مل گئی جو آپ نے گردن کاٹ دی۔ اب اس جنم میں دوستی تو کیجیے۔ امیر اور غریب کا ملاپ۔ چلو اگر میری بات نہیں مانیں گے تو کم از کم چھوٹے مالک کی بات ہرگز ہرگز نہیں ٹالیں گے نا۔ بیٹا سمجھ کر نہ سہی نیٹا سمجھ کر ہی سہی لیکن چھوٹے مالک آئے کیوں نہیں اب تک! آوازیں دو۔؟ چھوٹے مالک! چھوٹے مالک! یہ خاموشی کیوں چھا گئی۔ کوئی جواب کیوں نہیں دے رہا ہے۔ یہ کس کی آواز ہے؟ شکل تو دکھائی نہیں دے رہی ہے۔ ریڈیو کی آواز ہے۔ یہ۔ یہ۔ یہ کس کے بارے میں کہہ رہا ہے کوئی۔ کیا؟ کیا؟ کوئلے کی کان دب جانے سے پورا خاندان دب کر مر گیا۔؟ کمال ہے بڑا مالک نے ان کو بچایا نہیں؟ کیسے کیسے لوگ ہیں اس دنیا میں۔ کل ہی تو وہ مزدوروں کے بچوں میں مٹھائی تقسیم کر رہا تھا۔ غالباً نئی کان کا مہورت تھا اور آج؟ ارے۔ ارے۔ یہ میں کہاں آگیا ہوں۔ آس پاس اندھیرا کیوں چھا گیا۔ صبح کے بعد تو دن آتا ہے۔ یہ رات کیسے آگئی۔ ارے بھائی یہ کیا کر رہے ہو۔ میری ٹانگیں کیوں باندھ رہے ہو۔ منہ کھولنے دو؟ یہ چمکتی ہوئی چھری تو میرے چھوٹے مالک کی ہے۔ ارے مجھے معلوم ہے کہ ان کے امریکی دوست آئے ہیں۔ دعوت ہو رہی ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے۔ مگر تم یہ۔ یہ۔ چھوٹے مالک جان جائیں گے تو۔ بچاؤ چھوٹے مالک! چھوٹے مالک! چھوٹے ما۔ ماما!!
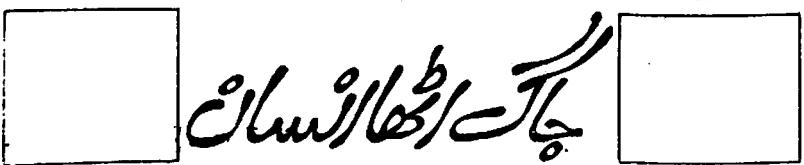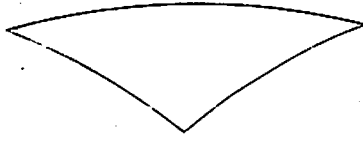
بابا کرموں کی بات کرتا ہے۔ پچھلے کرموں پر نئے جنم کی بات کرتا ہے۔ جنم کو وقت کے ساتھ جوڑتا ہے اور گرہوں کی دشائیں دیکھتا ہے۔ پھر افسردہ ہوکر خیرات کی بھیک مانگنے والے فریادی سے کہتا ہے۔ ہائے رے قسمت! کاش تم صرف دو منٹ پہلے پیدا ہوئے ہوتے تو بینک کے اعلیٰ افسر بلکہ وزیر خزانہ بھی بن سکتے تھے۔ بن سکتے کیوں بھلا؟ میں وثوق کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ بن چکے ہوتے۔ خیر یہ مٹی کا دیا لو۔ شام ہوتے ہی جلا کر اپنے ارد گرد پھیلی تاریکیوں کو مٹادو۔ بابا تم سے خوش ہے اسی لیے تم سیٹھ کے منشی ہو۔ ورنہ تم بھی ان لوگوں کی طرح کان کا بھیانک اندھیرا ہی دیکھا کرتے۔ اور نوٹوں کی گنتی کرنے کی بجائے سر پر لیمپ لگا کر ہاتھ میں لوہا لے کر کوئلے کی تہوں کو کاٹتے رہتے۔ کٹ۔ کٹ۔ کٹ یا پھر بھرتے رہتے بیلچوں سے باہر آنے والے کوئلے کی ٹرالیوں کو۔ پھل ٹوکری میں ڈال دو۔ روپیہ پیٹی میں ڈال دو۔ روپیہ پیٹی میں ڈال دو اور یہ دیا ہاتھ میں لے کر چلے جاؤ۔ من میں کھوٹ مت آنے دینا اور جب بھی تم ایسا کرو گے دیا بجھ جائے گا۔ بات سمجھ میں آئی نا؟

آس پاس کھڑے مرد و عورتیں بھلا اس بات سے کب انکار کرتے ہیں بلکہ کر ہی نہیں سکتے۔ جانتے ہیں وہ کہ اگر بابا کا آشیرواد ان کے سر پر نہ ہو تو ان سب کی زندگی اس سے بھی زیادہ دردناک ہوسکتی ہے۔ اس بار جب کسی بے وقوف نے کسی کے اکسانے پر بابا کی بے حرمتی کی تھی تب کان کے باہر سوکھا تھا۔ آسمان سے آگ برس رہی تھی مگر کان کے اندر اچانک جانے کہاں سے پانی آگیا اور سینکڑوں کام کرنے والے ڈوب کر یا دب کر مر گئے۔ وہ بھیانک حادثہ کیسے بھلایا جاسکتا ہے۔ مگر جانے کیوں روشن بار بار بابا کی باتوں کو قبول کرنے کی بجائے ان کے بارے میں سوچتا رہا ہے۔

آخر بات کیا ہے۔ وہ اور اس کا مالک ایک ہی دن ایک ساتھ پیدا ہوئے تھے۔ پھر ایک مالک اور دوسرا منددر کیوں؟ ہاں اتنا وہ ضرور جانتا تھا کہ جب سے بابا نے اس کو مٹی کا چراغ دیا ہے تب سے وہ کوئلے

کی کان سے باہر نکل کر اب انجن میں کوئلہ ڈالتا رہتا ہے اور جب چھوٹی پٹری والی ریل گاڑی بھر ابھر اکوئلہ لے کر مالک کے محل نما گھر کے قریب پہنچ کر سیٹی بجاتی ہے تب روشن کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ مہاوت آداب بجا کر ہاتھی کو آگے لے جاتا ہے اور عالم پناہ خوش ہو کر ایک سکہ بطور انعام دیتے ہیں۔ جب بھی کبھی وہ اپنے خیالات کا اظہار کرنے کی خاطر بابا کے پاس جاتا ہے تو بابا غالباً اس کی کیفیت بھانپ کر ایک سوال پوچھتا ہے۔ چراغ میں تیل نہیں ڈالتے نا پھر کیسے جلتا رہے گا۔؟ بجھتے دیے کی مانند بھڑک اٹھنا تو عقلمندی نہیں ہے نا۔؟ بال بچوں والے ہو جاؤ۔ لو کو بچائے رکھو۔

باباکو آس پاس کے لوگ ہی تو کیا شہر والے بھی مرادیں پوری کرنے والا بابا کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ایک برگد کے پیڑ کے نیچے جب تک ان کا جھونپڑا تھا تب تک صرف مزدور وہاں جایا کرتے تھے۔ کبھی کبھار بھجن وغیرہ بھی گایا کرتے تھے۔ بابا اپنی دہلیز پر ایک بہت بڑا مٹی کا چراغ رکھا کرتے تھے اور اپنے مریدوں سے یہی کہا کرتے تھے کہ میں اپنے چاہنے والوں کی مرادیں پوری کرتا ہوں گا۔ مجھ سے پیار کرنے والو اس چراغ میں گھی ڈالتے جاؤ۔ جوت جلتی رہے گی اور تاریکیاں مٹتی جائیں گی۔

شاید بابا کا دعویٰ صحیح بھی تھا۔ مگر جب سے کان مالک نے بابا کے لیے ایک سنگ مرمر کا آشرم بنا دیا تب سے بابا کی دہلیز پر مٹی کا چراغ ہٹا کر خوبصورت رنگ برنگے لمپ رکھے گئے۔ حالانکہ دستور کے مطابق بابا اب بھی ہر غریب یا امیر کو ایک مٹی کا ہی چراغ دیتا ہے۔ ہاں کرموں کی باتوں کو سہل طریقے سے سمجھانے کی خاطر اب وہ خوش بختی اور بدبختی کی باتیں کرتا ہے وہ بھی کبھی کبھار کرتا ہے جب کوئی سوال پوچھے تو ورنہ خود ہی سوچنا یا سمجھنا پڑتا ہے کہ کون خوش بخت ہے اور کون بدبخت۔ ہاں اشارہ یہ ہے کہ خوش بخت کے قدموں کی آہٹ بابا کا رکھارن سن کر وہ فوراً آنکھیں کھولتا ہے جب کہ بدبخت زیادہ سے زیادہ اپنے ہی احساسات کا شکار ہو کر رو پڑتا ہے۔ دعا کے لیے اٹھائے اپنے کانپتے ہاتھوں سے بابا کے پیر پکڑتا ہے۔ کافی سوچ وچار کے کے بعد آج روشن نے بھی بابا کے پیر پکڑ لیے۔ شاید اس لیے کہ اس کی بیوی کو ٹی۔ بی ہو گئی ہے مگر اس سے پہلے کہ بابا آنکھیں کھولتا انجن کی سیٹی نے اسے چونکا دیا اور وہ دوڑتا بھاگتا ڈیوٹی پر چلا گیا۔ آس پاس کھڑے لوگ اس حرکت کو بابا کا معجزہ سمجھ کر دل ہی دل میں دعا کرتے رہے۔ بابا۔ تم سے تو کچھ بھی چھپا نہیں ہے۔ مرادیں پوری کر بالن ہار۔!

سر پر کالا کپڑا باندھ کر جب روشن نے اپنے ہاتھ میں بیلچہ اٹھایا تو اس کو یوں محسوس ہوا کہ وہ اپنے

گلے میں پھانسی کا پھندہ ڈالنے کی تیاری کر رہا ہو۔ وہ انجن میں کوئلہ ڈالتا رہا۔ شعلوں کی تپش سے اس کا کالا چہرہ بھی لال نظر آنے لگا۔ بیمار بیوی اور اپنے ہونے والے بچے کے بارے میں سوچتے سوچتے وہ یہ بھی محسوس کرنے لگا جیسے یہ اذیت ناک ستم واقعی بابا کی بے رخی کا شاخسانہ ہے کاش اس نے وہ تھوڑا سا گھی بیمار بیوی کی خشک روٹی پر لگانے کی بجائے چراغ میں ڈالا ہوتا۔

کوئلہ جلتا رہا۔ انجن چلتا رہا اور روشن اپنے ارد گرد پھیلی تاریکی کو دیکھ کر لرز اٹھا۔ بالکل ویسی ہی تاریکی جیسے کان کے اندر ہوتی ہے۔ بابا مجھے معاف کردے۔ وہ چیخ پڑا اور اپنی آواز کی گونج سن کر لرز اٹھا۔ کئی رات جب روشن گھر پہنچا تو اس کی بیوی ہاتھ میں چراغ کو دیکھ رہی تھی کہ ٹمٹماتی جوت کب تک طوفان کا مقابلہ کر سکے گی۔ بابا نے کہا تھا کہ خوش بخت لوگ چراغ کو بجھنے نہیں دیتے۔ میں چراغ کو بجھنے نہیں دونگی بابا۔ وہ بڑبڑا رہی تھی۔

تھرتھراتی جوت اور بیوی کے کانپتے ہوئے ہاتھ دیکھ کر روشن نے اپنی خواہشات کا محیط بہت تنگ کردیا اور چراغ چھین کر وہ دعا کرتا رہا۔ میں اس چراغ کو اپنے خون سے جلاؤں گا۔ حالانکہ اس نے ایسا ہی کیا۔ جوت سنبھل گئی اور روشن کی بیوی خوشی سے جھوم اٹھی۔ گویا روشنی دیکھ کر اس نے اپنا روشن مستقبل دیکھ لیا ہو۔

روشن کے احساسات کا سلسلہ ٹوٹ گیا اور پھر سے ایک خیالات کا سلسلہ شروع ہوا۔ میری بیوی اتنی خوش کیوں ہے ؟

بیوی اس کی کیفیت سمجھ گئی اور سرگوشیانہ انداز میں کہنے لگی آج کل بابا چراغ کے ساتھ تعویز بھی دیتے ہیں۔ میں بھی لائی ہوں ایک سوا ایک روپے دے کر۔ اور مہینہ بھر بابا کے آشرم کے جھوٹے برتن صاف کر کے۔

بیوی اپنے آپ کو خوش بخت سمجھنے لگی تو بد بخت شوہر کا ہاتھ اٹھ گیا۔ چراغ بجھ گیا اور اندھیرے میں فقط میاں بیوی کا شور و غل ایسے سنائی دیا جیسے کان میں لوگ پھنس گئے ہوں اور باہر نکلنے کی کوشش کر رہے ہوں۔

آدھی رات کو اپنا غصہ تھوک کر جب روشن نے اپنی بیوی سے پوچھا کہ کھانا بنا ہے یا نہیں تو بیوی نے بمشکل اپنی سسکیوں پر قابو پاکر یہ کہہ دیا کہ اس نے سارا آٹا، چاول اور شکر فروخت کر کے ہی ستو

روپے فراہم کیے تھے۔

پھر دونوں بلک بلک کر رو پڑے اور تب تک روتے رہے جب تک سحر کی روشنی نے دریچوں سے اندر جھانک کر یہ بات نہ بتادی کہ تاریکیاں مٹ گئی ہیں۔

صبح ہوگئی تو کسی نے دروازے پر دستک دی اور کہا۔ روشن آج کوئی کام پر نہیں جائے گا۔ بابا بھی کہہ دے تب بھی نہیں۔

روشن نے دروازہ کھولا مزدوروں کا ہجوم ایک کارواں کی شکل اختیار کر رہا تھا۔ بابا کے آشرم کے باہر لگی بجلی کی محتاج بتیاں سورج کی روشنی کے سامنے بجھی بجھی سی نظر آرہی تھیں اور کان میں کام کرنے والوں نے مٹی کے چراغ دور پھینک کر اپنے ہاتھوں میں جھنڈے اٹھائے تھے۔

روشن نے بیوی سے کہا۔ کاش یہ سب پہلے ہوا ہوتا!
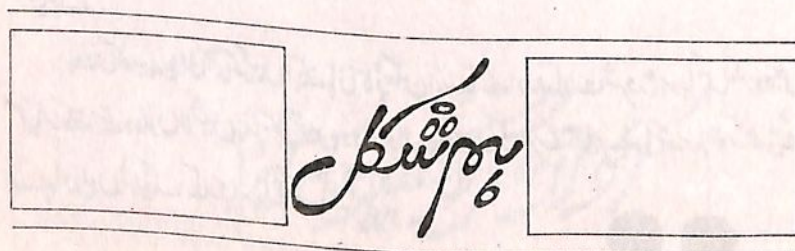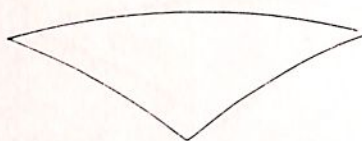
جن کی جیت ہوئی تھی ان کا جلوس قریب آرہا تھا اور جن کی ہار ہوئی تھی وہ جانے کی تیاری کر رہے تھے مگر چوراہے پر پچھلے کئی گھنٹوں سے جام لگا تھا کیونکہ چوراہے پر دو لاشیں تھیں۔

رکی ہوئی ٹریفک میں وہ بیمار بھی تھا جسے ہسپتال پہنچانے کی خاطر سائیکل رکشا والے کی قمیص پسینے سے بھیگ کر چپک گئی تھی۔ اس کی سانسیں پھول رہی تھیں۔ وہ مزدور بھی تھا جس کی سانسیں اس لیے رکی جا رہی تھیں کہ دیر سے پہنچنے پر فیکٹری کا مالک اس کی چھٹی نہ کر دے۔ وہ پریشان تھا۔ وہ طالب علم بھی تھا جس کے امتحان شروع ہونے میں چند منٹ باقی تھے۔ وہ حیران بھی تھا اور پریشان بھی۔

دونوں لاشوں کی شناخت ہو چکی تھی۔ اتفاقاً دونوں کا نام روشن بتایا گیا تھا۔ ایک روشن لال اور دوسرا روشن علی۔ دونوں غریب اور دونوں نوجوان تھے۔

ایک مندر بنانے کے لیے سر پر کفن باندھ کر نکلا تھا اور دوسرا مسجد بچانے کی خاطر سر ہتھیلی پر رکھ کر چوراہے پر آیا تھا دراصل آئے تھے یا بھیجے گیے تھے یہ کسی کو معلوم نہیں تھا دونوں کو کب کس نے اور کیسے مارا یہ سوال کوئی کرتا تو شاید جواب ملتا مگر چوراہے پر رکی ٹریفک یہ جاننے کے لیے بے تاب تھی کہ کب یہ معلوم ہو سکے کہ دونوں میں روشن لال کون ہے اور روشن علی کون ہے تاکہ لاشوں کو وارثوں کے حوالے کر دیا جائے۔

پولیس کو یہ پریشانی تھی کہ کہیں ابلتے پانی کا ڈھکن اڑ نہ جائے اور فسادات شروع ہو جائیں مگر وہ بھی کیا کر سکتے تھے دونوں لاشیں ہم شکل تھیں دو جڑواں بھائیوں کی طرح۔ ظاہر ہے ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہے اور یوں ٹریفک رکی رہی۔ جانے کب تک۔
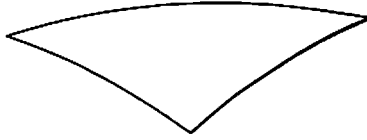
آواز سرگوشیوں کی

جھیل کے گہرے پانی میں رہ کر اس نے کائنات کے خالق تین سروں والے برہما کو دیکھا تھا۔ کالے ناگ کی گود میں بیٹھے لکشمی نارائن کو دیکھا تھا۔ مگر سرگوشیوں کی آوازیں سن کر جب ایک گہری جھیل سے نکل کر دھرتی کو پہلی بار دیکھا تب انسان نے انسان کو قتل کرنا شروع کر دیا تھا۔ جانے وہ تلوار کی تیز دھار سے کٹ گیا تھا یا کسی نوکیلے نیزے سے ڈنٹھل سے الگ ہو چکا تھا۔ مگر اس نے برہما کو جھیل کی گہرائی میں ڈوبتے ہوئے ضرور دیکھا تھا۔

جھیل سے نکل کر کھلا کھلا مگر ڈنٹھل سے ٹوٹا کنول کا پھول آبشاروں میں اچھلتا رہا ندی نالوں میں بہتا رہا۔ بے بس کناروں اور سخت چٹانوں سے ٹکراتا ہوا جب سمندر میں جا گرا تب وہ سڑا ہوا کنول کا پھول تھا۔ بلکہ چند حصوں میں تیر رہا تھا۔ ہر حصہ ایک پنکھڑی تھا اور ہر پنکھڑی اپنے طور پر اپنی زندگی بچانے کی کوشش کر رہی تھی مگر ایک پنکھڑی سمندر کی عمیق گہرائیوں میں برہما کا آسن ڈھونڈ رہی تھی۔ لکشمی نارائن کا سنگھاسن تلاش کر رہی تھی۔

سمندر میں سناٹا تھا۔ آس پاس مگر کچھ تو تھے مگر کہیں بھی کالا ناگ نہ تھا۔ سمندر کی لہروں کا سہارا لے کر کبھی وہ کنارے سے بہت دور بہت دور چلا جاتا تھا اور کبھی واپس آجاتا تھا۔ آتی جاتی لہروں کے سہارے ادھر ادھر کرتے صدیاں بیت گئیں۔

ایک دن کنارے کے قریب پہنچتے ہی اس نے کسی کی سرگوشیانہ آوازیں سن لیں۔ یوں لگا جیسے کوئی بچہ رو رہا تھا۔ دراصل کنارے پر ایک سیپی پڑی تھی اور سیپی کے اندر کوئی کچھ کر رہا تھا۔ پنکھڑی نے جب اسے چھوا تب سیپی کا منہ کھل گیا۔ سیپ کے اندر موتی نہیں تھا بلکہ ایک بدشکل کیڑا تھا۔ وہ بچے ہی کی مانند رو رہا تھا شاید وہ بہت بھوکا تھا مگر پنکھڑی کو دیکھ کر کیڑا حرکت میں آیا اور قہقہے لگانے لگا۔ ہر قہقہے کے ساتھ اس کا منہ

بڑا ہوتا گیا اور پنکھڑی فوراً سمجھ گئی کہ کیڑا اس کو دیکھ کر نہیں بلکہ اس کے جسم پر لگے خون کے چھینٹے دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ ہوا کے جھونکے نے ساتھ دیا تو کنول کی پنکھڑی اڑ کر بہت دور چلی گئی اور ایک چنار کے درخت کی شاخوں میں چھپ گئی۔ پنکھڑی جان گئی تھی کہ کیڑے کی غذا صرف انسانی خون ہے اور چونکہ انسانی خون کے چھینٹے پنکھڑیوں پر جم کر پھول کا حصہ بن چکے تھے اس لیے اگر اس کی خبر نہیں تو نسل آدم کا کیا ہوگا۔ یوں صدیاں بیت گئیں۔

سرگوشیوں کی آوازیں ہر کنول کے پھول کو چونکاتی رہیں۔ خوفزدہ کرتی رہیں مگر ان کی کشمکشِ زندگی جاری رہی۔

سحر ہوتی رہی شام ہوتی رہی اور ہر رات کو کسی پراسرار قدموں کی آہٹ چونکاتی رہی۔ سرگوشیوں کی آوازیں ڈراتی رہیں اور ایک بے شکل خوف اس کا تعاقب کرتا رہا۔

گھبرا کر اس نے آدھی رات کو چنار کے پتوں سے پوچھا۔ مانا کہ دستک ہوا نے دی تھی۔ کھڑکی آندھی نے کھول دی تھی مگر وہ آواز کس کی تھی۔ رات کو صرف شیطان جاگتا ہے نا۔ پر کون تھا وہ؟ وہ سرگوشی تھی یا کسی کا ان دیکھا وجود۔۔ وہ کوئی بدشکل کیڑا تو نہیں تھا؟

چنار کے پتے سو رہے تھے مگر شاخ پر اونگھتے ہوئے کبوتر نے جواب دیا۔ میں بھی یہی سوچ رہا ہوں کہ وہ کون تھا۔ تین سر ہوتے تو میں سمجھتا برہما ہے۔ مگر وہ ایک پری تھی جو صندل جیسے بدن پر چندن لگا کر کنول کے پھولوں کا ہار پہن کر یہاں رقص کرنے آئی تھی اور سنو یہ پتے گونگے بہرے سہی۔ لولے لنگڑے سہی، مگر تھوڑی دیر پہلے ناچ رہے تھے۔ وہ مینکا تھی جو شاید وشوامتر کی تپسیا بھنگ کرنے آئی تھی۔ کوئی اور بھی ہو سکتی ہے۔ مگر کیا بتاؤں کہ وہ کتنی سندر ہے۔ جیسے تاروں کے جھرمٹ میں کوئی مہ جبیں چلتی ہے تو گیسو یوں اڑتے نظر آتے ہیں جیسے چاندنی راتوں میں شانت جھیل کی چھوٹی چھوٹی لہریں۔ صبح کا انتظار کرو شاید یہیں کہیں نظر آجائے۔ میں بھی انتظار کر رہا ہوں حالانکہ میرا جسم لہولہان، درد کی شدت برداشت نہیں ہو رہی ہے اور شکاری صبح ہوتے ہی میری تلاش کرے گا۔ صبح ہوئی تو زمین پر زرد پتے ابدی نیند سو رہے تھے۔ سرسبز پتوں نے دھوئیں سے لپٹ کر دھول کی چادر اوڑھ لی تھی۔ کبوتر کو شکاری لے جا چکا تھا اور کنول کا پھول شبنم کے قطرے چاٹ کر سرگوشیانہ انداز میں اپنے مالک کو آوازیں دے رہا تھا۔ اور خون کے آنسو رو رو کر کہہ رہا تھا کہ برہما کا آسن ہوں، دنیا بنانے والے نے یہ کیسا انیائے کیا ہے۔

کوئی مجھے برہما جی کے پاس کیوں نہیں لے جاتا۔ گھبرا کر اس نے پھر اپنے آپ کو ان ہواؤں کے سپرد کیا جو جھیل کی طرف جا رہی تھیں۔

دھوپ بہت تیز تھی۔ پیارے پودوں کی چتائیں جل کر راکھ ہو چکی تھیں۔ گاؤں والے گاؤں چھوڑ کر چلے گئے تھے یا گرم ریت میں دھنس کر مر گئے تھے۔ مگر جو عورت برگد کے پیڑ کے نیچے بیٹھی تھی وہ شکنتلا تھی۔ مینکا اور وشوامتر کی بیٹی۔ وہ گربھ وتی تھی اور اس کی خاطر اس کا شوہر بھی اسے اس اجڑے دیار میں رکا ہوا تھا۔

تپتی زمین میں دراڑیں تھیں اور اب اونٹوں کا حلق بھی سوکھ چکا تھا۔ ہر طرف گرم ہوائیں تھیں کیونکہ دور کہیں تیل کے کنویں جل رہے تھے۔ گربھ وتی کے خشک ہونٹوں کو ریت نے رنگ ڈالا تھا پھر بھی وہ بہت خوش تھی۔ وہ اس لیے کہ سرگوشیوں کی آوازیں اس کو لبھا رہی تھیں۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ آوازیں اس کے گربھ سے آ رہی ہیں دراصل وہ آوازیں اس کے شوہر کی تھیں۔ وہ اپنے لہولہان ناخنوں سے زمین کھرچ رہا تھا۔ ریت کے چمکیلے ذروں میں پانی کی بوندیں دیکھ کر شاید اپنے آپ سے بات کر رہا تھا تب تک گربھ وتی سوکھے کنویں پر بیٹھی کنول کے پھول پر پڑے اوس کے قطروں کو دیکھ کر ہلکے ہلکے سُروں میں گنگنا کر آکاش میں بادل تلاش کر رہی تھی۔ گربھ وتی کے پیار کو دیکھ کر جب کنول کے پھول میں ممتا جاگی تب وہ گربھ وتی سے لپٹ گیا اس کی کوکھ سے کان لگا کر کل کے انسان سے باتیں کرنے لگا۔

اچانک دور دور سے آئے۔ صحراؤں میں کوسوں پیدل چلنے والے رنج و غم میں ڈوبے پیاسے لوگوں نے جب میاں بیوی کو دیکھا تو وہ دونوں پر ٹوٹ پڑے تاکہ کنویں پر قبضہ کر لیں۔ گربھ وتی نے کنول کو آنچل میں چھپا لیا، شاید یہ سمجھ کر کہ وہ اس کا بچہ ہے اور پھر وہ چیخ پڑی گویا ایک سوکھی ندی میں آگ کا دریا بہنے لگا تھا۔ وہ تب تک چیختی رہی دوڑتی رہی جب تک کہ اس کا راستہ وشال سمندر نے نہ روکا۔

سمندر دیکھ کر کنول کا پھول مسکرایا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ اچھل کر پانی میں ڈبکی لگاتا اس نے سرگوشیوں کی آواز سن لی یہ آواز سمندر کی ایک بہت ہلکی اونچی لہر کی آواز تھی جو کنول کو سرگوشی کے مانند لگ رہی تھی۔

اپنے ارد گرد کروڑوں لہروں کو دیکھ کر وہ اونچی لہر دھرتی پر آ کر من کی تیاری کر رہی تھی۔ دراصل اونچی لہر پر چکرورتی راجہ بن جانے کا بھوت سوار تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے جب سمندر اچھلتا ہوا زمین کو دبوچنے لگا تب

ہمالیہ کی چوٹی پر بیٹھے شیو شنکر بھولے ناتھ پاروتی سے کہہ رہے تھے۔ ایک گیان یہ بھی ہوگا مگر دھرتی پر آگ برسانے والا راکھشس خود ہی بھسم ہو کر پگھلتے ہوئے برف کے پانی کے ساتھ بہہ جائے گا۔ تب دھرتی کی کوکھ ٹھنڈی ہو گی۔ شکنتلا کی کوکھ سے بھرت پیدا ہوگا اور وہی ایک نیا سنسار بسائے گا۔ یہ سب کنول سن چکا تھا اور وہ بہت خوش تھا کیونکہ شانتی کے ماحول میں برہما کا آسن اور لکشمی نارائن کا سنگھاسن تلاش کرنا آسان تھا مگر اس سے پہلے کہ بھرت پیدا ہوتا۔ بارود پھٹ گیا اور دھرتی کی تپش سے ہمالیہ بھی پگھل گیا۔ سمندر کے پانی میں آگ لگ گئی۔ ہوا کا منہ کالا ہوا۔ آسمان کا رنگ لال۔ ایک راکھشس گلے میں کٹے ہوئے سروں کی مالا پہن کر ہاتھوں میں بم اور بارود لیے ہوئے اپنی فتح کا رقص کرتا رہا اور ہر طرف خون کی ندی بہتی رہی یا آگ کا دریا بہتا رہا بھگوان شنکر نے غصے میں آکر ٹانڈو کیا اور یوں صدیاں بیت گئیں۔

دور دور تک پھیلے ہوئے صحرا میں ٹھہری ٹھہری ریت کی لہریں بڑبڑا رہی تھیں تو کنول کے پھول نے پوچھا کہ تم کس راکھشس کا ذکر کر رہے ہو۔ صحرا نے آہ بھر کر کہا۔ یہ اس راکھشس کی کہانی ہے جس نے اپنے طلسمی کلہاڑی سے روپہلی پانی کی لہروں کو ذرّوں میں قید کر دیا تھا۔ جبھی تو وہ دور دور سے آتی جاتی سمندر کی لہروں کو دیکھ کر سرگوشیانہ انداز میں دعا کر رہے ہیں کہ تن سے تن کا ملاپ ہو۔ پانی کا مٹی سے ملاپ ہو۔ دراصل صحرا بھی خواب دیکھ رہا تھا اور ان کی باتیں سن کر کنول بھی سپنا دیکھ رہا تھا۔ برہما کا آسن بن جانے کا۔ لکشمی نارائن کا سنگھاسن پھر سے دیکھنے کا۔ مگر اچانک جرس کی آواز سن کر لہروں کا خواب ٹوٹ گیا۔ ایک کھلبلی مچ گئی اور لہر لہر کے درمیان دراڑیں پڑ گئیں۔ قافلے کے سردار نے کارواں کو روکنا چاہا تو دیکھا وہ کب کا منتشر ہو چکا ہے مسافر بھی کنول کے پھول کی طرح یوں بھٹکتے رہے جیسے تیز آندھی میں گھاس کے تنکے۔

جانے کیسے یہ معجزہ ہوا۔ کنول کا پھول گربھ وتی کے دامن سے لپٹ گیا۔

گربھ وتی دوڑتی بھاگتی رہی۔ ایک دراڑ میں پانی بہہ رہا تھا دراصل وہ ایک دیا تھا جو دو رکسی صدیوں پرانے گلیشیر کے دامن سے نکل کر مہاتما بدھ کی طرح شانتی کا پرچار کرنے چل پڑا تھا۔ یہ جان کر کہ دریا کی منزل وہی پُر سکون جھیل ہے جہاں برہما جی رہتے ہیں کنول کا پھول بہت خوش ہوا دریا میں ایک ناؤ تیر رہی تھی۔ اور وہ موجوں سے یوں ڈول رہی تھی جیسے نیلے نیلے آکاش میں اڑتا ہوا ایک مست کبوتر۔

گربھ وتی نے ناؤ کو دیکھا تو پانی میں کود پڑی۔ جانے کیوں کشتی نظروں سے اوجھل ہوئی۔ شاید وہ

کاغذ کی ناؤ تھی جو پر کٹے کبوتر کی طرح پھڑ پھڑا کر پانی کے بوجھ سے ہی الٹ گئی اور پھر ڈوب گئی۔

گربھ وتی اور کنول دونوں موجوں سے مسکراتے دریا کی روانی کے ساتھ بہتے گئے بہتے گئے کنول کو برہما جی کو پانے کی آرزو تھی جب کہ شکنتلا کو کسی پرسکون جگہ کی تلاش تھی جھیل واقعی پرسکون تھی۔ کنول کا پھول مستی میں جھومنے لگا۔ واقعی یہ وہی جھیل تھی جس کو کشیپ رشی نے سنوارا تھا۔ گربھ وتی کنارے پر بیٹھ کر دور دور تک پھیلی جھیل کو دیکھتی رہی۔ اچانک اس نے ڈوبر یمیوں کی سرگوشیوں کی آواز سنی۔ دونوں ایک ساتھ مرمٹنے کی قسمیں کھا رہے تھے۔ مگر اچانک زور کی آندھی چل پڑی۔ سرد ہواؤں نے اس کشتی کو روکا جو شاید نوحؑ نے بھیجی تھی۔ کالی گھٹاؤں نے مانجھی کو لوٹا۔ اس سے اس کا چپو چھینا۔

دونوں پریمی پریت کی خاطر ایک دوسرے سے لپٹ گئے اور دور برفیلے پہاڑوں میں بیٹھے برف کے دیوتا کو ملتجی نظروں سے دیکھتے رہے۔

شام نے کروٹ لی اور چار سو اندھیرا چھایا۔ سرد ہوائیں خاموش ہو گئیں۔ سرگوشیوں کی آوازیں سسکیوں میں ڈوب گئیں۔ خاموشی سے گھبرا کر گربھ وتی کو یوں لگا جیسے اس کے گربھ کی آوازیں بھی خاموش ہو گئی ہیں۔ اس کے ہاتھ یخ ہو گئے اور جھیل کی طرح اس کے ہونٹ بھی منجمد ہو گئے۔

دوسرے دن صبح سویرے جب برفیلے پہاڑوں کے پیچھے چمکتا ہوا سورج طلوع ہوا تو ایک بوڑھیا نے لوگوں کو بتایا۔ وہ دیکھو برف کے دیوتا۔ میں نے کہا تھا نا کہ جب جب دھرتی پر پاپ ہی پاپ ہوں گے تب تب ایسے ہی برف کے دیوتا دھرتی پر اتر آئیں گے اور راکھشسوں کی لگائی ہوئی آگ کو بجھا دیں گے۔ بچے ہنس پڑے۔ دادی ماں یہ تو کسی نے جھیل کی یخ بستہ تہہ پر برف کے دو بت بنائے ہیں۔

بوڑھیا غصے سے بڑبڑاتی رہی اور دستور کے مطابق برف کے دیوتاؤں کی آرتی اتارتی رہی۔ تب برف کے بوجھ سے جھکی ٹہنی پر سوچ میں ڈوبی مرغابی نے گربھ وتی کے کان میں کہا۔ بارود کی گرمی سے جب برف پگھل جائے گی تب یہ دیوتا غائب ہو جائیں گے۔ ایک ہنگامہ برپا ہوگا اور جانے کتنی لاشیں ٹوٹے کنول کی طرح جھیل میں تیرتی نظر آئیں گی۔

بوڑھیا جب یہ بتائے گی کہ پاپی لوگوں نے برف کے دیوتاؤں کو بھگایا تب تمہارا بچہ پیدا ہوگا۔ مگر میرے بچے کا کیا ہوگا؟ شکنتلا بڑبڑائی بچہ پیدا ہوتو کیا سے کیا ہو گیا تھا شکنتلا ایک کھلے میدان

میں لگائے گئے کیمپ میں رہتی ہے۔ خیمے میں دبک کر بیٹھی ماں اپنے بچے کے سر پر بار بار ہاتھ پھیر کر ان سرگوشیوں کو سننے کی کوشش کر رہی ہے جو خیمے کے باہر کھڑے شرنارتھیوں کی دبی دبی آواز ہے۔ وہ لوگ بھی خیمے سے کان لگا کر میاں بیوی کی سرگوشیانہ باتیں سننے کی کوشش کر رہے ہیں۔

بیوی کہہ رہی تھی "چلو اپنے گاؤں چلیں اور اپنے برگد کے پیڑ کے نیچے اپنا گھر بنا ڈالیں"۔

شوہر نے جواب دیا "ان جڑوں کے نیچے ناگوں نے بل بنا لیے ہیں۔ یہ مجھے ماسٹر جی نے بتلایا ہے" بیوی نے ٹوک کر کہا "نہیں وہ جڑیں برگد کی شاخیں ہیں دراصل وہ شیو جی کی جٹائیں ہیں۔ یہ مجھے میری دادی جی نے بتایا ہے"۔

اچانک کنول کا پھول بول پڑا تو گربھوتی سمجھی اس کا بیٹا بول اٹھا ہے۔ آواز سرگوشیانہ تھی۔ مگر سننے کی کوشش کی تو کنول کا پھول کہہ رہا تھا کہ برگد کے پیڑ کے اندر کسی نے بندوقیں چھپائی ہونگی یہ کسی نے ہمیں کیوں نہیں بتایا۔ میاں بیوی کچھ دیر کے لیے سکتے میں آ گئے۔ پھر خاموشی ٹوٹی تو بیوی بولی کاش ہمارا بیٹا مہابھارت کا ویر کرن ہوتا۔ شوہر بولا۔ لیکن جیت تو تیر انداز ارجن کی ہوئی تھی۔ بیوی بولی۔ ارجن کو ڈاکوؤں نے مارا تھا، کاش میرا بیٹا بھگوان کرشن کا اوتار ہوتا تو تمام دکھوں کا انت ہوتا۔ شوہر بولا ـ بھگوان کرشن کو بھی ایک شکاری نے دھوکے سے مارا تھا۔ کاش میرا بیٹا بھی اتنا ہی طاقتور ہوتا جتنا کہ وہ بیٹھا دہشت گرد ہے تاکہ وہ اس سے اس کی بندوق چھین کر ہم سب کو اس جہنم سے نکال دیتا۔ پھر دونوں خاموش ہو گئے۔

خیمے کے باہر کھڑے لوگ سمجھ گئے کہ ہجرت کے فولادی مکوّں نے میاں بیوی کا دماغ کچل ڈالا ہے۔ کنول کا پھول بچے کے جسم کے ساتھ لپٹ گیا اور پھر سوچتا رہا کہ کب یہ بچہ بڑا ہو جائے اور مجھے واپس جھیل میں ڈال دے۔

بچہ بڑا ہو گیا۔ کنول کا پھول جھیل میں ڈبکیاں لگاتا رہا برہما جی کا آسن اور لکشمی نارائن کا سنگھاسن تلاش کرتا رہا مگر تب تک سیپ سے نکلے ہوئے بدشکل کیڑے کا منہ دھرتی سے بھی بڑا ہو چکا تھا۔ کنول کا پھول تو چھوٹا تھا ہی بچہ بھی مکوڑا بن چکا تھا۔